October
2021

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

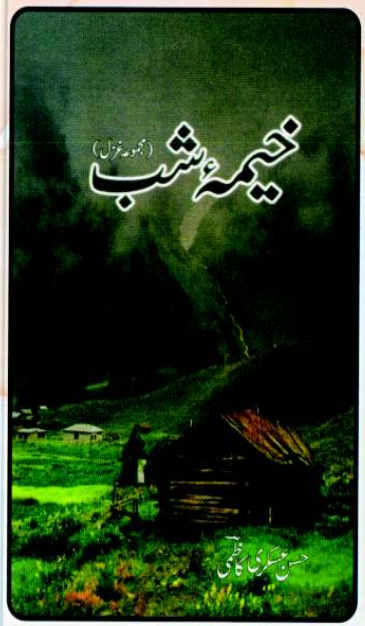
خیمۂ شب
(مجموعہ غزل)
حسن عسکری کاظمی

ارتکاز
نوید صادق

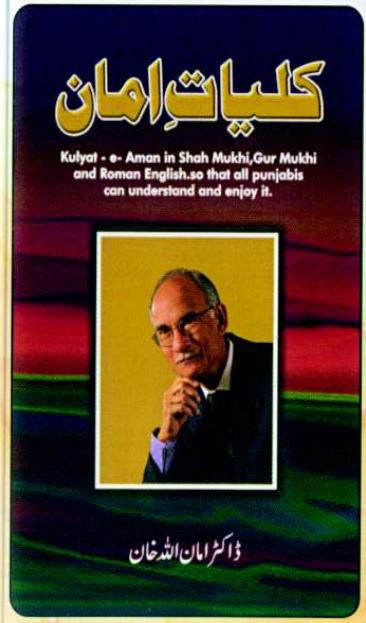
کلیاتِ امان
Kulyat - e- Aman in Shah Mukhi,Gur Mukhi and Roman English.so that all punjabis can understand and enjoy it.
ڈاکٹر امان اللہ خان

باسی ٹکڑے والا
۔۔۔اور دوسری کہانیاں
اعجاز روشن

بانی مدیر خالد احمد

مصطفیٰ زیدی

حریصِ لذّتِ آزار ہو تو ایسا ہو
کوئی بتوں کا پرستار ہو تو ایسا ہو

خُمِ وقار نہ توڑا ، نفس کدہ چھوڑا
سبُو کشِ مے پندار ہو تو ایسا ہو

شراب میں سمِ قاتل بھی کر لیا شامل
نشے میں بھی کوئی ہشیار ہو تو ایسا ہو

طربِ اساس کو بھائی لحد کی تنہائی
کوئی سکوں کا طلب گار ہو تو ایسا ہو

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شارح

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - اکتوبر 2021 - شمارہ نمبر: 10

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی، محمد انیس انصاری، افضال احمد انور، سرور حسین نقشبندی	7 تا 11
2	نعت	ریاض مجید، نسیم سحر، محمد یٰسین قمر، خاور اعجاز، علی اصغر عباس، اکرم ناصر، اکرام الحق سرشار، سرور حسین نقشبندی، عباس عدیم قریشی، اسد رضا سحر	12 تا 20
3	عقیدت	سید ریاض حسین زیدی، مرزا آصف رسول	21 تا 22
4	رباعیات	محمد ارشاد	23 تا 24
5	ہائیکو/ماہیے/گیت	خاور اعجاز، انجم جاوید، ممتاز راشد لاہوری، گلزار بخاری	25 تا 28
6	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	29 تا 32
7	افسانے	بشریٰ رحمٰن، رشی خان، حبیب الرحمٰن، فصیحہ آصف خان، سید تحسین گیلانی، فرخندہ شمیم، نیلما ناہید درانی، عزیز عادل، نوین روما، محمد آفتاب تابش، سلمان یوسف سمیجہ، نور کماں شاہ	33 تا 79
8	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	80 تا 89
9	یادیں	رخشندہ نوید، صوفیہ بیدار	90 تا 103
10	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، خورشید رضوی، جلیل عالی، جمیل یوسف، انور شعور، نسیم سحر، رفیع الدین راز، خاور اعجاز، رشید آفرین	104 تا 172

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	غلام حسین ساجد، افتخار شاہد، سید قاسم جلال، منظور ثاقب سید ضیا حسین، راحت سرحدی، اقبال سروبہ، صفدر صدیق رضی اسلام عظمی، شوکت محمود شوکت، حامد یزدانی، محسن اسرار طارق بٹ، شفیق احمد خان، علی اصغر عباس، خالد علیم علی حسین عابدی، نوید صادق، بدر منیر، انصر حسن، اکرم ناصر آفتاب خان، سید فرخ رضا، شاہد ماکلی، شاعر علی شاعر محمد نوید مرزا، اشرف کمال، رضا اللہ حیدر، احمد جلیل عقیل رحمانی، شہزاد احمد شیخ، عنبرین خان، نعیم رضا بھٹی حسنین سحر، اشفاق ناصر، ظہور چوہان، رخشندہ نوید، ناصر علی عاطف جاوید عاطف، عاصم اعجاز، تصور اقبال، شاہد فرید بشیر احمد حبیب، زبیر فاروق، محمود کنجی، صغیر احمد صغیر، کوکی گل نائلہ راٹھور، امتیاز انجم، ازور شیرازی، فرح شاہد، عدنان خالد رفعت وحید، احمد سجاد بابر، وسیم جبران، راجہ عبدالقیوم رضی رضوی، عمران اعوان، اسد رضا سحر، شہاب اللہ شہاب سرفراز عارض، طلحہ بن زاہد، مزمل رضا سارب	104 تا 172
11	شاعرِ امروز	قمر عباس، مبین دھریجو [شاہد ماکلی]	173تا174
12	طنز و مزاح / خاکہ	سیدہ آمنہ ریاض	175تا176
13	مضامین	جمیل یوسف، محمد ارشاد، جلیل عالی، تسنیم سحر حامد یزدانی، زاہد حسن، خالق آرزو	177 تا 215
14	نظمیں	امجد اسلام امجد، جلیل عالی، گلزار بخاری، خاور اعجاز طالب انصاری، حامد یزدانی، محمد نوید مرزا، شبہ طراز، رخشندہ نوید راجہ عبدالقیوم، نائلہ راٹھور، خالق آرزو، اعجاز رضوی	216 تا 230
15	خطوط	آصف ثاقب، جمیل یوسف، تسنیم سحر، ممتاز راشد لاہوری آفتاب احمد ملک، طالب انصاری، اشرف کمال عقیل رحمانی، رانا محمد شاہد	231 تا 241

حمد

نظر مری پسِ اَفلاک ہو تو حمد کہوں
کچھ اُس کی ذات کا اِدراک ہو تو حمد کہوں

گداز دِل میں ذرا اَور پیدا ہو جائے
یہ آنکھ اَور بھی نمناک ہو تو حمد کہوں

میں ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں، سمیٹ لوں خود کو
بحال یہ دلِ صد چاک ہو تو حمد کہوں

ابھی تو ہے مری آنکھوں پہ جہل کا پردہ
مَیں مُنتظِر ہوں کہ یہ چاک ہو تو حمد کہوں

زمیں پہ رہ کے مری سوچ کچھ حدود میں ہے
کوئی اشارۂ افلاک ہو تو حمد کہوں

پُرانے لگتے ہیں لفظوں کے پیرہن مُجھ کو
عطا کوئی نئی پوشاک ہو تو حمد کہوں

نگاہِ خواجۂ لولاک ہو تو بات بنے
عطائے خواجۂ لولاک ہو تو حمد کہوں

گھِرا ہوا ہوں میں دُنیا کی عِلتوں میں نسیم
کدورتوں سے یہ دل پاک ہو تو حمد کہوں

نسیمِ سحر

حمد

خدا ہے جس نے کیا ممکنات کو پیدا
ہر ایک چیز ، ظواہر ، ثبات کو پیدا

وہ موسموں کو تغیر کا رنگ دیتا ہے
وہی ہے جس نے کیا دن کو، رات کو پیدا

یہ شرق و غرب، شمال و جنوب، ارض و سما
فقط اسی نے کیا شش جہات کو پیدا

چلائے سانس ہمارے، جو چاہے رک جائیں
کیا ہے کیسا حیات و ممات کو پیدا

اسی نے خلق کیا ہے بڑے قرینے سے
صدف سے موتی کو، لفظوں سے بات کو پیدا

حدِ کمال کو پہنچا کمال کن فیکون
کیا جو آپؐ کی ذات و صفات کو پیدا

رسائی اس تلک آسان یوں ہوئی ہے ریاض
کہ ذکرِ دوست کرے حسنِ ذات کو پیدا

سید ریاض حسین زیدی

حمد

لکھنے کا ہنر، دولتِ فن اُس کی عطا ہے
مخلوق میں جو لوح و قلم بانٹ رہا ہے

ہم، مٹّی کے ذرّوں کو چلا رکھا ہے اُس نے
آندھی میں بکھرنے سے بچا رکھا ہے اُس نے

آنکھوں میں اگر دم ہے، تو ہے اُس کے ہی دم سے
زندہ ہیں اگر ہم، تو فقط اُس کے کرم سے

مخلوق کی تخلیق ہے اِک 'کُن' کا اِشارہ
ہے سارے جہانوں پہ فقط اُس کا اِجارہ

میرا بھی وہ خالق، مری اولاد کا خالق
ماں باپ کا خالق، مرے اَجداد کا خالق

وہ عقل کے، ادراک کے، محور سے جُدا ہے
وہ کیا ہے، وہ کیسا ہے، فقط اُس کو پتہ ہے

پاتال میں سورج کو سرِ شام سُلا دے
تاریکیٔ شب کو مہ و انجم کی ضیا دے

انسان نئے دنیا میں آتے بھی رہیں گے
کچھ دیر ٹھہر کے یہاں، جاتے بھی رہیں گے

ہے ایک گھرانے کو چلانا، یہاں دُشوار
وہ سارے جہانوں کا اکیلا ہی جہاں دار

سبحان! انیسِ دل و جاں آپ کی شاہی
ہر لمحۂ موجود تری دے گا گواہی

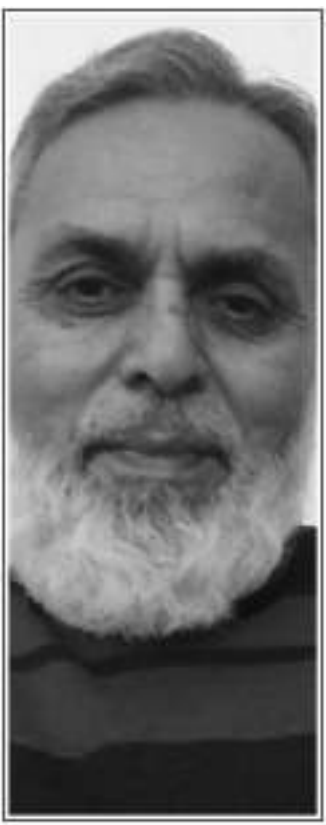

محمد انیس انصاری

حمد

ضیائے نجم و مہ و آفتاب کس کی ہے؟
فضائے نیل و فرات و چناب کس کی ہے؟

وہ جس کے ذکر سے ہر سو مہک مہک اُٹھی
یہ بُوئے رشکِ عبیر و گلاب کس کی ہے؟

ہر ایک شے میں ہر اک جا ظہور ہے کس کا ؟
ورائے دید بھی خوئے حجاب کس کی ہے؟

ہے تظلمِ خشک و ترِ جملہ عالمیں کس کا ؟
یہ بزمِ کون و مکاں اے جناب! کس کی ہے؟

یہ کس کے قبضۂ قدرت میں ہے نظامِ کاشت؟
سحاب کس کا، زمیں کس کی، داب کس کی ہے؟

بجا ازل ہی سے مستِ الست ہیں ہم لوگ
ہمارے ظرف میں مُہنہ شراب کس کی ہے؟

وہ پہلی ''نہ'' پہ بھی اِعطائے اختیار انورؔ
یہ حوصلہ، یہ تحمل، یہ تاب کس کی ہے؟

اِفضال احمد انور

حمد

کرم کا رحمتوں کا دان رکھنا
میں عاصی ہوں مجھے حیران رکھنا

تری رحمت فزوں تیرے غضب سے
خدایا اس یقیں کا مان رکھنا

فقط ''لاتقنطوا من رحمت اللہ''
مرے کتبے کا یہ عنوان رکھنا

ملا کر سرحدِ ارضِ حرم سے
فضائے ارضِ پاکستان رکھنا

برائے وقتِ آخر یہ دعا ہے
سلامت اس گھڑی ایمان رکھنا

سنا ہے یہ گھڑی مشکل بہت ہے
مراحل نزع کے آسان رکھنا

بنیں گے مر کے جب مہمان تیرے
تو اپنی شان کے شایان رکھنا

سبھی کچھ سونپ کر سرور اسی کو
ہمارا کام ہے ایقان رکھنا

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

خیال و خواب میں بارش ہے نعت اجالوں کی
سکوں کی زندگی ہے ہم مدینہ حالوں کی

خبر کسی کو کہاں؟ جو خوشی ہے بخت اُن کا
حیات خلد کی صورت ہے نعت والوں کی

مدینے آیا ہوں جب سے، مسلسل آمد ہے
ثنائی جذبوں کی اور نعتیہ خیالوں کی

عطا جو ہوتے ہیں اُس در سے گاہ گاہ ہمیں
عجب ہیں لذتیں اُن نُور کے نوالوں کی

ہوئے نصیب ہمیں بھی حرم کے کچھ دن رات
یہی عطا ہے بہت، جانے والے سالوں کی

فرشتے عرش کے بھی مانگتے ہیں خیر، شہا!
ترے اویسیوں کی اور ترے بلالوں کی

نفوس قدسیہ، عشرہ مبشرہ تیرے
کوئی مثال کہاں، ایسے بے مثالوں کی

جو مل رہے ہیں صفِ نعت میں ــــ پذیرائی
ہو والہانہ سب اُن تازہ نونہالوں کی

رہیں خجستہ و خوشحال سارے نعت شعار
ریاضؔ خیر ہو سارے ثنا خصالوں کی

ریاض مجید

نعتؐ

جو اُس مدینۂ جنّت نشاں کو دیکھ لیا
تو گویا حاصلِ کون و مکاں کو دیکھ لیا

وُہ بام و در تھے عجب نور میں نہائے ہوئے !
کہ جیسے سلسلۂ کہکشاں کو دیکھ لیا

اب اَور کیا مُجھے کچھ دیکھنے کی خواہش ہو؟
دیارِ نُور کو ، شہرِاماں کو دیکھ لیا

کچھ اَور بڑھ گیا احساسِ تنگیِ داماں
جو آپؐ کے کرمِ بے کراں کو دیکھ لیا

نہ کرسکا مجھے خائف کبھی کوئی سورج
کہ مَیں نے ان کے خنک سائباں کو دیکھ لیا

مدینہ دیکھ کے لگتا ہے یوں نسیمِ سحر
زمیں پہ اُترے ہوئے آسماں کو دیکھ لیا

نسیمِ سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

نعتؐ

اک حلقۂ الطاف میں، دامانِ کرم میں
صد شکر کہ ہر آن ہوں مدحت کے حرم میں

صد شکر کہ وہ چشمِ کرم میری طرف ہے
صد شکر کہ ہر آن ہوں اک ناز و نعم میں

یاد آئی ہے سرکارؐ دو عالم کی وہ بستی
یا نور کی رم جھم ہے مرے دیدۂ نم میں

بیتاب دلی پائے سکینت کے خزانے
جس آن بھی یاد آئیں نبیؐ عرصۂ غم میں

یوں مدح و ثنائے شہِؐ ابرار ہے جیسے
اک گوہرِ نایاب ہو انوار کے یم میں

ممکن ہی نہیں آپؐ سا آفاق میں کوئی
اے ذوقِ نظر! دیکھ عرب میں نہ عجم میں

اک حوصلہ دیتی ہے فقط آپؐ کی سیرت
اس دورِ بلا خیز میں، اس عہدِ ستم میں

وہ ذاتؐ کہ ٹھہری ہے جو سرنامۂ تخلیق
شہ سرخی وہی ذاتؐ ہے اخبارِ امم میں

اس ذات کی عظمت کا بیاں ہو بھی تو کیسے
شامل ہوں ابوبکرؓ و عمرؓ جن کے خدم میں

جس آن بھی لکھا ہے قمر اسمِ محمدؐ
اک روشنی در آئی ہے قرطاس و قلم میں

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

وہ فاصلہ ہے کہ لمحہ بھی سال ہے آقاؐ
مدینہ دُور ہے ، اِس کا ملال ہے آقاؐ

خراب حال ہیں اقوام بالعموم ، مگر
خراب تر تری اُمت کا حال ہے آقاؐ

مگر بھلائے ہُوئے ہیں اصولِ راہبری
اگرچہ سامنے تیری مثال ہے آقاؐ

سوائے ایک تمنائے حاضری ، مجھ پاس
نہ زادِ راہ نہ مال و منال ہے آقاؐ

سیاہ کار کے چہرے پہ نور آ جائے
کرم کی ایک نظر کا سوال ہے آقاؐ

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم نے اس سال بھی جی بھر کے نہ دیکھا تجھ کو
خالد اس سال بھی ہم نے وہی نادانی کی

نعتؐ

خمِ شعور سے ہر معرفت کشید کئے
حضور آئے تھے توحید کو وحید کئے

دل و نگاہ مکمل تھے گوش بر آواز
کہ ناشنیدہ کو حق مان کر کشید کئے

فضا تھی سرمدی کیف و سرور سے معمور
سرُودِ اقراء تھا روح الامیں نوید کئے

لسانِ عشق نے غارِ حرا سے چُن چُن کر
بیان و حرف سے صوت و صدا جدید کئے

کتاب خالق و مخلوق کا وثیقہ ہے
صحیفے لوح پہ تائید ہیں مزید کئے

زمین خانۂ ویران ہو نہیں سکتی
اِسے ہے گنبدِ خضرا جمالِ دید کئے

رسول ، انبیاء اور اولیاء منزہ ہیں
نفوسِ قدسیہ رب نے جو ہیں خرید کئے

درود پڑھتے ہوئے کائنات جھومتی ہے
صلائے خیر نے دن رات اپنے عید کئے

حضورِ غیب پہ ایمان بالیقین ہوا
رکوع و سجدہ ہیں جو روح کو مرید کئے

علی اصغر عباس

نعتؐ

ہم خدا کو ہی خدا کہتے ہیں
آپ کو اس کی عطا کہتے ہیں

ہے وہی آپ کا جھوٹا پانی
سب جسے آبِ بقا کہتے ہیں

ان کی چوکھٹ کو جو چھو کر آئے
ہم اسے بادِ صبا کہتے ہیں

زہر آلود ہوا کرتی تھی
شہر کی آب و ہوا کہتے ہیں

لوگ کہہ دیتے ہیں خوشبو اور ہم
تیرے کوچے کی ہوا کہتے ہیں

کوئی لوٹا نہیں در سے خالی
میں نہیں سارے گدا کہتے ہیں

آپ ہی تو ہیں مجسم قرآں
جو یہ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

آپ جس دل کو بھی رونق بخشیں
ہم اسے غارِ حرا کہتے ہیں

اکرم ناصر

نعتؐ

دنیا کی ہر فضا میں اجالا رسول کا
یہ ساری کائنات ہے صدقہ رسول کا

ایسی مثال ہو گی نہ ایسی مثال ہے
خوشبو گلاب کی ہے پسینہ رسول کا

قرآن پڑھ کے دیکھا تو معلوم یہ ہوا
اللہ کی زبان ہے لہجہ رسول کا

توحید کے خلاف کھلی جب کوئی زباں
لب پر تھا سنگ ریزوں کے کلمہ رسول کا

اصحاب ہیں ستارے تو مہتاب ہیں رسول
سب پر کھلا ہوا ہے دریچہ رسول کا

سرشارؔ نعت کیوں نہ لکھے آں حضور کی
سرشارؔ بھی ہے ماننے والا رسول کا

اکرام الحق سرشار

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر ذرّے کو سورج سے ہم آہنگ کیا
تو نے ہر قطرے میں اک بحر کی وسعت لکھی

نعتؐ

خود سکھائے ادب ثنائے رسولؐ
لکھنے لگتا ہوں جب ثنائے رسولؐ

اُنؐ کی چشمِ کرم سے ممکن ہے
خود سے ہوتی ہے کب ثنائے رسولؐ

دن کی ٹھنڈک درود کا نغمہ
جگمگاتی ہے شب ثنائے رسولؐ

آنکھ ہوتی ہے نم جو پچھلے پہر
ہونے لگتی ہے تب ثنائے رسولؐ

جب سے کھولی شعور نے آنکھیں
تب سے کرتے ہیں لب ثنائے رسولؐ

کیسے خوددار ہو کے جیتے ہیں
یہ سکھاتی ہے ڈھب ثنائے رسولؐ

راضی کرتے ہیں اپنے مولا کو
آؤ کرتے ہیں سب ثنائے رسولؐ

میرے لفظ و خیال میں سرورؔ
روشنی کا سبب ثنائے رسولؐ

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

نگاہ کن کہ فضائے دروں کبیدہ ہے
کمال لطف حضور آپ کا شنیدہ ہے

حضور ظرف بھی مل جائے بھیک کے شایاں
حضور دامن اوقات ما دریدہ ہے

ہوا لذائذ عالم سے وہ تو مستغنی
حضور آپ کے غم کا جو دل چنیدہ ہے

کہاں اٹھاتے ہیں سر، اہل سر جو ہیں ان کے
غرور عشق گدایان در خمیدہ ہے

زباں سے کہنا ضروری نہیں عدیم یہاں
ہر ایک اشک مرے کیف کا جریدہ ہے

عباس عدیم قریشی

تمہارے در پہ جھکی ہے جبینِ حرف وصدا
''مہ و نجوم سے پُر ہے زمینِ حرف وصدا''

تری عطا کے سبب لوگ جان لیتے ہیں
کہاں کہاں پہ جڑے ہیں نگینِ حرف وصدا

میں جب سے لوٹ کے آیا ہوں کربلا سے مجھے
بلا رہے ہیں مسلسل مکینِ حرف وصدا

جو لے کے آتا ہے پیغام کبریائی کا
وہ جبرئیل ہے تیرا امینِ حرف وصدا

درود پڑھنے سے مشکل کشائی ہوتی ہے
اسی پہ ہے مرا کامل یقینِ حرف وصدا

درود تجھ پہ ہوا ہے خدا کے مظہر کا
تُو خوش نصیب ہے کتنی زمینِ حرف وصدا

اسد رضا سحر

عقیدت

ڈوبے سفینے پار لگائے رسولؐ نے
بگڑے تھے جو بھی کام بنائے رسولؐ نے

جو کچھ نہ تھے، وہ آپؐ کے در پر غنی ہوئے
یہ معجزے دکھائے عطائے رسولؐ نے

جو ناتواں تھے، کوئی انہیں پوچھتا نہ تھا
ہمت بندھائی ان کی ثنائے رسولؐ نے

بے رہروی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی
رستہ دکھایا سیدھا دعائے رسولؐ نے

صحت کی دولتوں سے نوازے گئے علیل
فیضان کر دیا ہے ردائے رسولؐ نے

جو مضمحل تھے، عضو معطل تھے، ہر طرح
ڈھارس بندھائی ان کی شفائے رسولؐ نے

کسب معاش کوئی ہو لیکن حلال ہو
صحرا میں آپ اونٹ چرائے رسولؐ نے

لائے محبتوں کا، مواخات کا نظام
بچھڑے ہوؤں کے بھاگ جگائے رسولؐ نے

جن کو ملی تھیں قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں
ٹھوکر پہ ان کو رکھا گدائے رسولؐ نے

جو کچھ بھی این و آں میں میسر ہوا ہمیں
اس سب کے خدوخال سجائے رسولؐ نے

بے جان پتھروں کو بھی گویائی مل گئی
وحدت کے ایسے گیت بڑھائے رسولؐ نے

بنجر تھی جو زمین، وہ زرخیز ہو گئی
سرسبز اس پہ پیڑ لگائے رسولؐ نے

میں تھا ریاض راندۂ درگاہ اک فقیر
احوال میرے بگڑے بنائے رسولؐ نے

سید ریاض حسین زیدی

کرم، یارسولؐ اللہ

کرم، یارسول اللہ! عطا، یارسولؐ اللہ!
اندھیروں میں ہوں میں نا سزا، یارسولؐ اللہ!

نظر، تن، جگر، دل، جاں مرض بڑھ گیا سب کا
دوا یارسولؐ اللہ! شفا، یارسولؐ اللہ!

ترے دیں کی عظمت کو تو مانے ہیں منکر بھی
مرا دیں ہے جو رسوا ہوا، یارسولؐ اللہ!

دل و جاں ہوئے طیبہ میں گم یہ بھی کھو جاتی
لیے پھر رہا ہوں جو اَنا، یارسولؐ اللہ!

فعولُن مفاعی لُن کے پابند تھے جذبے
میں شعروں میں کیا کرتا ثنا؟ یارسولؐ اللہ!

زہے "طَلَعَ البَدرُ عَلَینا" کہ طیبہ میں
ہے سرشار اب بھی مرحبا، یارسولؐ اللہ!

کوئے "مِن ثَنِیّاتِ الوَداع" میں لے جائے
مرے آنسوؤں کو بھی صبا، یارسولؐ اللہ!

تھا جو "وَجَبَ الشُّکرُ عَلَینا" سے حق ہم پر
اُسے کھا گیا عہدِ ریا، یارسولؐ اللہ!

جو "لَا تَرفَعُوا اَصوَاتَکُم" ہم سمجھ لیتے
نہ ہوتے جہاں میں بے نوا، یارسولؐ اللہ!

کسے پاسِ "اُنظُرنَا" کہ خود آج امت کی
زبانِ عمل ہے "رَاعِنَا"، یارسولؐ اللہ!

کبھی وہ بھی دن آئیں کہ گونجے درودوں کی
مرے گنبدِ جاں میں صدا، یارسولؐ اللہ!

دلِ زندگی کیا ہے سرِ بندگی کیا ہے
اگر جاں نہیں تجھ پر فدا، یارسولؐ اللہ!

نثار آسماں کیا کیا ہوئے عشق کے تجھ پر
مرا علم ہے اب بھی خلا، یارسولؐ اللہ!

حمیدِ ازل کی ہے تجلی سے تُو احمد
تری حمد ہے لاانتہا، یارسولؐ اللہ!

جہاں سب کا وہ محمود ہے تُو محمد ہے
کہ اس حمد میں ہے خود خدا، یارسولؐ اللہ!

شبستانِ "یَبقٰی وَجہُ رَبِّک" فدا تجھ پر
ترے عشق ہی کو ہے بقا، یارسولؐ اللہ!

تو عشقِ ابد ہے اور ترے آئینے میں ہی
وہ حسنِ ازل ہے خودنما، یارسولؐ اللہ!

یہی ناز ہے خود پر کہ میں تیرا آصف ہوں
شرف ہے مرا مجھ سے بڑا یارسولؐ اللہ!

مرزا آصف رسول

خودکلامیاں [رباعیات]

تقدیر کے سامنے ہے بے بس تدبیر
تدبیر پہ پا لیتی ہے غلبہ تقدیر
تھا تیر ہوا خطا ، تھا تکّہ گویا
تکّہ تھا ہدف پہ جا لگا بن کر تیر

دن کو آرام ہے نہ شب کو ہے سکوں
بیچارے پکشیوں کا ہے حال زبوں
دن کو باز آئے اور جھپٹے مارے
اُلّو مارے ہے شب کو آکر شبخوں

بھولا ہے نہ بیمار ، ہے بلکہ مکار
اُلّو ہے باز سے بھی بڑھ کر خونخوار
سویا رہتا ہے جاگتوں میں دن کو
شب کو کرتا ہے سونے والوں کو شکار

پردے ہوں تنے لاکھ پڑے پھر بھی جھول
کھلتا ہے سیاست میں ہی اک اک کا پول
چٹکی بھی بجانا جو سمجھتے تھے گناہ
وہ لوگ سبھی بجا رہے ہیں اب ڈھول

جلدی کیجیے نہ ہو کہیں جائے دیر
دونوں ہاتھوں سے تھام رکھنی ہے چنگیر
آنے ہی کو ہے نظام دینوں کا نظام
جھڑنے کو ہیں آسماں کی بیری سے بیر

ہے ساز نہ سوز بس ہے ہاہاکاری
ہوتی ہے بجا کے ڈیسک موسیقاری
من بھاون راگ دو سیاست میں ہیں
یعنی اک ''مال'' کونسں اک درباری

لگوایا باغ کی دعا پڑھ کے درود
معلوم نہ تھا کہ گھات میں ہیں مردود
دی کھاد بھی پانی بھی دیا ، پر کیڑے
اندر اندر سے کھا گئے سب امرود

جیسے ہیں خواص ٹھیک ویسے ہی عوام
بدلیں گے نہ خود کو تو نہ بدلے گا نظام
گردن پہ چھری پھری نہ ہو یا ہو پھری
چوری کی ہے مرغی کہ شتر مرغ حرام

سُرمہ آنکھوں میں ہے نہ رُخ پر غازہ
پھر بھی ہے اثر زباں میں بے اندازہ
سُن کر ان کی زباں سے کُھل جا سِمسِم
کُھل جائے ہے اپنے آپ ہر دروازہ

جس اور گئے دھرے قدم گن گن کے
دل تو ہے جواں ہیں گو رسیدہ سن کے
گفتار میں گہ گہے کھجائیں داڑھی
چبھنے لگتے ہیں جو چھپے ہیں تنکے

دربار کو جان کو مغازہ آئے
جب بھی چاہے بِلا اجازہ آئے
ہوتی ہیں بحال رونقیں چہروں پر
دربار میں جب بھی دو پیازہ آئے

ہاں مُوتُوا قبل اَن تَمُوتُوا* شاباش
اس حال میں چھٹا ہے نہ کوئی وشواش
بہتر ہے بیخودی خودی سے ہر گاہ
افیوں نہ ملے تو پھانک لیجے خشخاش

آنے کا نہیں ابھی کسی کو بھی یقین
آئے گا یقین جب ہوا اک دو تین
حاضر ہو جائیں گے ہزاروں جِنات
رگڑے گا چراغ جس گھڑی اللہ دین

ہرگز نہ ہوئی سیدھی ساری گئی جل
جل کر بھی نہیں نکلے رسی کے بل
کچھڑے ورلڈ بینک سے عاریتۃً
بلوائے بھی گئے کئی ٹو ڈر مل

صنعت دنیا ہے بسکہ صنعت ہی دین
ادیان دگر تمام زیرِ قالین
لے لے گی مشین آدمی کی بھی جگہ
یا بن جائے گا آدمی آپ مشین

بِکتا لگتا نہیں ہے مرغِ زرّین
کایاں ہے مگر ہے دام ہمرنگِ زمین
دنیا کو کیا شکار امریکا نے
امریکا کو شکار کرنے کو ہے چین

محمد ارشاد

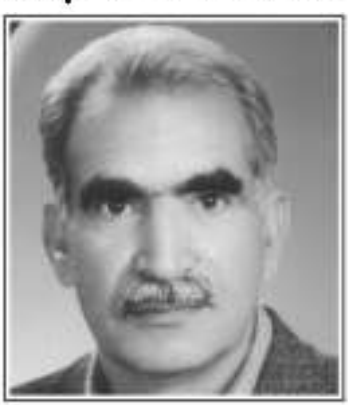

* مرجاؤ اس سے پہلے کہ مر جاؤ۔ بعض صوفیا کا ماٹو

(Jane Reichhold)

Moving into the sun
The pony takes with him
Some mountain shadow

سورج میں چلتے
گھوڑا لے گیا اپنے ساتھ
پربت کا سایہ

خاور اعجاز

A spring nap
Downstream cherry trees
in bud

موسمِ گل میں نیند کی چھپکی
جیسے موجود ہوں شگوفوں میں
لبِ دریا درخت چیری کے

Long hard rain
Hanging in the willows
Tender new leaves

سردیوں کی طویل بارش میں
پیڑ پر جھولتے ہوئے قطرے
تازہ پتوں کا پیش خیمہ ہیں

Ancestors
The wild plum
blooms again

آبا و اجداد
جنگلی آلوچے جیسے
پھر سے کھِل اُٹھیں

ہائیکو

پتے لہرائے
اوس کے قطروں نے چوما
پھول بھی شرمائے

.....

گھر میں آئی بہار
کھیتوں میں جو کی خوشبو
چڑیوں کی چہکار

.....

خوشبو مہکی ہے
دیکھا تیرے چہرے کو
تتلی مچلی ہے

.....

بارش سردی کی
اندازہ کرنے میں یار
تم نے جلدی کی

انجم جاوید

ماہیے

خوشیوں میں بہتے ہیں
جھگڑا کیا کرنا
مِل جُل کر رہتے ہیں

دُوری کی فضا کیسی
اپنوں سے کیا پردہ
دلبر سے حیا کیسی

بے زاری قبول نہیں
چھوڑ دیں دنیا کو
دل اتنا ملُول نہیں

ماحول بناؤ جی
ہم بھی مہک جائیں
کچھ پھول سجاؤ جی

اُلجھیں گے بہاروں سے
ہجر کی راتوں میں
کھیلیں گے ستاروں سے

اُڑتا ہوا بادل ہے
رُت ہے گلابوں کی
جذبات میں ہلچل ہے

ممتاز راشد لاہوری

گیت

سجے ہیں پیار کے خواب آنکھوں میں
دل پر دستک دی سورج نے
چمکے ہیں مہتاب آنکھوں میں

روپ تیرا کیا من میں سمایا
رنگوں والا موسم آیا
بس گئے سرخ گلاب آنکھوں میں

من سے من کو مل جانے دے
ان پھولوں کو کھل جانے دے
کب تک یار حجاب آنکھوں میں

زخم جدائی کا گہرا ہے
تجھ سے دوری میں ٹھہرا ہے
جیون ایک سراب آنکھوں میں

ضبط کا بندھن ٹوٹ نہ جائے
آس کی ڈوری ٹوٹ نہ جائے
صبر کہاں بے تاب آنکھوں میں

گلزار بخاری

پریتم ایسی پریت نہ کریو

یہ کیسے ممکن ہے کہ تڑپ نہ ہو اور محبت مل جائے قرب بھی حاصل ہو جائے جبین نیاز میں سجدے مچل اٹھیں گے تو رکوع و سجود ہوگا اور سجدے لذت سے بھر پور ہونگے۔ شناسائی اور قربت تو بس اک اندر کی چیز ہے جذبہ ہے کشش ہے جس میں صرف محبت کرنے والے کو علم ہوتا ہے یا جس سے محبت کی جائے اسے پتہ ہوتا ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس سے محبت کی جائے اسے عاشقوں کی پسندیدگی اور جان ڈالنے والے جذبے کی خبر نہ ہو چلیے معشوق حقیقی تو ہے ہی قدرتوں والا دنیاوی عمومی محبتوں میں بھی محبوب محبّ سے بے خبر نہیں رہ سکتا مگر کوئی اپنے محبوب سے کیسے پیار کرے کس طرح سے محبت کرے اس بارے معروف اللہ والے بھگت کبیر فرماتے ہیں۔

پریتم ایسی پریت نہ کریو جیسی کرے کھجور
دھوپ لگے تو سایہ نا ہی بھوک لگے پھل دور
پریت کبیرا ایسی کریو جیسی کرے کپاس
جیو تو تن کو ڈھانپے مرو نہ چھوڑے ساتھ
پریت نہ کریو پنچھی جیسی جل سوکھے اڑ جائے
پریت تو کریو مچھلی جیسی جل سوکھے مر جائے

.....

اب اگر رب سے پریت کو دیکھا جائے تو وہ کوئی شخصیت تو ہے نہیں جس سے پیار کیا جائے اور نہ ہی کوئی بندہ رب کے شایان شان اس سے محبت کر سکتا ہے رب سے محبت کی چاہ اور راہ ہی دراصل عشق حقیقی ہے بس اس کا بندے پر فضل ہی محبت ہے کرم ہی پیار ہے بس اسی کی خوشی ہی گندے مندے بندے کی معراج ہے یہی محبت کا ثبوت ہے اب نہ تو اس محبت کی کوئی گرائمر ہے نہ قائدہ نہ اس کی کوئی ماضی مضارع کی گردان ہے نہ فارمولا نہ یہ کتابوں سے آ سکتی ہے نہ وظائف سے نہ یہ محنت سے حاصل ہوسکتی ہے نہ مجاہدے سے نہ کسی یونیورسٹی سے مل سکتی ہے نہ ڈگری سے نہ ہی اس کا کوئی ٹیبل ہے نہ جدول نہ ہی اس کا کوئی دستور ہے نہ قانون بس مالک جسے عطا کرنا چاہے عطا کر دے جو پریت عطا کرتا ہے وہ بتا بھی دیتا ہے سکھا بھی دیتا ہے کہ ایسے پریت کریو یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی والی بات ہے چھوٹا بچہ اداب، محبت بتا اور سکھا رہا ہے وہ پریت کے آداب سے واقف ہے اس لیے تو کہہ رہا ہے۔

سلیمان عبداللہ ڈار

،،ابا اگر آپ کے رب کی یہی مرضی ہے تو کر گزریں مجھے پیٹ کے بل لٹا دیں میری آنکھوں پر پٹی باندھ دیں کہیں شفقت پدری غالب نہ آجائے،،

اور اسی طرح کی باتیں جو میں نے بھی آپ نے بھی سنیں مگر ان پر غور کریں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پریت کیسے کریں محبت ایسی ہو جو ہر پل ساتھ دے جینا مرنا اسی کے اندر ہو اس سے دور کبھی نہ ہو دور ہو تو تڑپ تڑپ کر جان دے دی جائے بس اس پیار اس پریت کا سدا انتظار رہے اس طرح سے انتظار والا وقت بھی محبت ہی کے دورانیے میں شمار ہوگا کہ یہ سفر کبھی ختم ہونے والا نہیں کہ پریت کے بعد کچھ اور پریت کو جی چاہے گا یا اک بحر بیکراں ہے اک لامحدود راستہ ہے جو لامکان اور سدرۃ المنتہیٰ سے بھی پرے جا نکلتا ہے اس راستے کی خوبی یہ ہے کہ چاہے کتنا ہی دشوار گزار ہو راہی کو مایوس نہ ہونا ہوگا ہر لحظہ امید کا دامن تھامنا ہوگا کہ مایوسی میں نہ ہی قربت ملتی ہے نہ ہی محبت نہ ہی شکر کا مقام آتا ہے نہ ہی کوئی انعام ملتا ہے نہ ہی محبت میں میں نکلنے والے تنہائی والے آنسو ملتے ہیں نہ ہی محبت والا غم نہ ہی در آستاں ملتا ہے نہ ہی پیاسی جبین نیاز کو سنگ آستاں میسر آتا ہے نہ ہی محرم ملتا ہے نہ ہی محرم راز نہ ہی مقامات صبر سے آشنائی ہوتی ہے نہ ہی بندہ رضا کا پیکر بنتا ہے نہ ہی کرم کی پہچان ہوتی ہے نہ ہی دل دل گداز بنتا ہے نہ ہی سوز میسر آتا ہے نہ ہی آہ سحر گاہی نہ ہی کوئی محسن ملتا ہے نہ ہی چارہ ساز نہ ہی مایوس آدمی اس راہ کے سربستہ رازوں پر غور کرتا ہے نہ ہی اپنے محبوب ذات کی صفات کے بارے سوچتا ہے۔

پریت کی راہ مشقت اور تکالیف سے اٹی پڑی ہے مگر سچا پریت والا اسے اپنے اعمال کا شاخسانہ نہ سمجھتا ہے عام لوگ جس مقام پر صبر کرتے ہیں وہ اس پر شکر کرتا ہے اور دل کی آخری تہہ سے مالک پر راضی رہتا ہے۔ زندگی میں جو بھی اونچ نیچ ہو نفع نقصان ہو نشیب و فراز ہو غمی خوشی ہو وہ ہر جذبے ہر آس ہر نراس کی مہار اپنے محبوب حقیقی کی طرف موڑ دیتا ہے اگر پیار کرنے والا سچا نہیں تو وہ کسی سچے کا انتظار نہیں کر سکتا سچے محب کو راستے کی دشواریوں پر تعجب نہیں ہوتا اس کی طلب کم نہیں ہوتی ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ توقعات سے روگردانی کر جائے کوتاہی اس کے لیئے جرم عظیم ہے اگر اس کی بلند ھمتی نادانیوں کے جال میں پھنس جائے تو وہ عاشق صادق نہیں کچھ اور ہی ہے ہاں وسوسہ آ سکتا ہے مگر اس میں بھی سچا راہی ثابت قدم رہتا ہے۔ اور اپنے مالک کو (جو اس کا محبوب بھی ہے) ضرور پکارتا ہے جو اسے تشکیک کی وادیوں میں بھٹکنے نہیں دیتا اسے پہاڑوں جیسا پکا اور غیر متزلزل یقین عطا کرتا ہے حیرت کی بات ہے - امیر المجاہدین حضرت خالد بن ولیدؓ کے خیمے میں رات کے وقت مخالف فوج کا اک غیر مسلم جنگجو داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اک سریع الاثر زہر کو حضرت خالد بن ولیدؓ کے حلق میں انڈیلنے کی کوشش کرتا ہے مجاہد اس پر قابو پالیتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایمان اور یقین کی گہرائی کیا ہوتی ہے چھری کے اندر کاٹنے والا حکم اللہ نے رکھا ہے

وہ اس میں سے اپنا حکم نکال لے تو نبیؑ پوری قوت سے بھی چھری چلائے اسماعیل کا گلہ نہیں کٹے گا اس زہر کے اندر مارنے کی قوت اللہ نے رکھی ہے اگر رب مجھے مارنا نہیں چاہتا تو اس زہر سے کچھ بھی نہیں ہوگا (محبّ پکا تھا کچا نہیں تھا) زہر کی شیشی کافر کمانڈو کے ہاتھ چھین کر خالد بن ولیدؓ پوری شیشی پی گئے اب جو مارنے آیا تھا وہ ہکا بکا دیکھ رہا ہے۔ پریت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ خالد بن ولیدؓ کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ رب کریم کسی بھی عاشق صادق کا بال بھی بانکا نہیں ہونے دیتے اگر عاشق کا نقصان ہو گیا تو پھر وہ رب کاہے کا ہوا؟

زہر اس کے حکم کا محتاج ہے وہ اپنی حدوں سے کیسے بڑھ سکتا ہے مگر اس کام کے لیئے حضرت خالد بن ولیدؓ جیسا ایمان اور یقین ہونا ضروری ہے ان جیسا والہانہ پن اور رسالتؐ کی محفل ضروری ہے۔ جو ڈھیلے ڈھالے یقین والا عاشق امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا ہوا سے کیا خبر کہ پریت کیسے کی جاتی ہے اس لیے اُسے بزرگ یہی کہتے ہیں:

پریتم ایسی پریت نہ کریو

.....

قلبی امید کی اک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ محبت کے سرچشمے کی طرف لے جاتی ہے یعنی محبوب کی طرف راغب کرتی ہے اب اس امید کو راستے کا کوئی خوف ختم نہیں کر سکتا امید مزید کوشش پر اکسائے گی یہ دن وے ہے تو اک راستہ ہی مگر اسپر چلنے والے دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں اور کوئی بھی راستہ ہو اس کے راہی راہ کے اختتام پر ڈرتے ہیں وحشت زدہ ہو جاتے ہیں ڈرتے ہیں اسی لیے سلطان العارفین حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں۔

جس مرنے تھیں خلقت ڈردی باہو عاشق مرے تاں جیوے ہو۔

دور حاضر جیسے پرفتن دور میں چاہ کی راہ پر چلنے والے نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں اس لیے کوئی ایسا راہی ملے تو اس کی پذیرائی ضرور کرنا ہو گی اس سے الفت روا رکھنا ہوگی کہ یقیناً اس کے دل میں اللہ جل شانہ کی محبت والی بتی جلتی تو ہوگی یقیناً وہ اک شکر گذار بندہ تو ہوگا ہی کہ

ہر راہ پہنچتی ہے تیری چاہ کے در تک

.....

جو دن وے کالی کملی والے سید الاولین اور آخرینؐ ہمیں دکھا کر گئے اسی سے غالب اکثریت ڈی ٹریک ہو گئی اس پٹڑی ہی سے اتر گئی۔ الا ماشاء اللہ ہمارے خوش ذوق قارئین میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اس دن وے پر خوشی سے چل بھی رہے ہیں اور بہت سے لغزش پا کی وجہ سے بے راہ بھی ہو چکے آپکی خدمت میں بڑے ہی ادب اور محبت سے گذارش ہے کہ امت نے عمومی طور پر اپنے نبیؐ کے احسانات بھلا دیے امت نے نبیؐ والے اخلاق اور اعمال بھلا دیئے امت نے زیادہ طور مالک سے بے وفائی کی نبیؐ سے بے وفائی کی کیسے؟ دین کو گھر سے دیس نکالا دے دیا آپؐ والے اعمال کو بازاروں سے گلیوں سے محلوں سے شہروں سے نکالا اپنے جسم سے لباس سے معاشرت سے

سیاست سے زراعت سے دفتروں سے تجارت سے اسمبلیوں سے وزارت سے اور پھر معاذ اللہ دل سے نکالا کسی دلآزاری مقصود نہیں اک مجموعی تاثر جو بنا وہ بیان کر رہا ہوں کوئی ایسا رونے والا مجھے دکھائیں جو میرے اور تیرے لیے حضرت اماں جی عائشہؓ کے حجرے میں ساری ساری رات رو کر گزارے اماں جی فرماتی ہیں کہ آپؐ کے سینے سے رونے کی آواز کے ساتھ ایسی آواز آیا کرتی تھی جیسے ہانڈی کے اندر گرم سالن میں سے بلبلے پھوٹنے کی آواز آتی ہے پاؤں پر ورم آجاتا تھا کس کے لیے؟ ہم سب کے لیے جو اکثریت میں آپؐ والے اخلاق سے دور ہیں - آپؐ والے ون وے کو چھوڑ چکے یا چھوڑتے جا رہے ہیں - کوئی ایسا رونے والا دکھائیں جو گناہگاروں اور باغیوں کے لیے روئے راقم نے اکثر اس پر غور کیا تو یہی سمجھ آیا کہ آپؐ کی اپنی کوئی خواہش نہیں اپنی کوئی آرزو ہی نہیں بس دل میں ہماری ہی پریت ہے - ہائے افسوس! صد افسوس جس نے ہم پر زندگی واردی اسے ہی زندگی سے نکال دیا جو میری وجہ سے بھوکے پیٹ سوتے رہے میں نے اپنی کھانے کی میز پر کئی کئی ڈشز اور اشتہا انگیز خوشبودار کھانے کھاتے لذت کام ودھن کے وقت انہیں یاد بھی نہ کیا بزرگان دین سے سنا ایک روز سرکار دو عالم نے فرمایا:

،، عائشہؓ! بھوک بہت لگی ہے! ،، اماں جیؓ فرماتی ہیں رنگ زرد ہو گیا تھا آپؐ اسی گھبراہٹ میں مسجد نبوی تشریف لے گئے کعب بن عجرہؓ وہاں موجود تھے ان کے سامنے بیٹھ گئے - پیٹ پر انگلی مبارک رکھی اور فرمایا

،، آج تین روز ہو گئے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا،،

انہی کی امت کا تاجر کہتا ہے ملاوٹ نہ کروں تو کچھ کما ہی نہیں سکتا - افسر کہتا ہے رشوت نہ لوں تو گذارا ہی نہیں ہوتا - وکیل کہتا ہے بھاری فیس نہ لوں تو وائٹ کالر قائم ہی نہیں رہتا - اسی ادھیڑ بن میں حضورؐ ایک باغ میں تشریف لے گئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ ساتھ تھے دو جہانوں کے سردار نے گری پڑی کھجوریں اٹھا کر صاف کیں کھانا شروع کیں اور پوچھا

،، عبداللہ تو کیوں نہیں کھاتا ،،

ان کا دل بھر آیا عرض کی ،، یا رسولؐ اللہ مجھے بھوک نہیں ،، آپ اس روز چار دن سے بھوکے تھے آپؐ کی امت کے معززین بڑے بڑے لیڈر چند ڈالروں پر بک گئے کوئی نئے ماڈل کی گاڑی پر خرید لیا گیا تو کوئی عہدے پر جو ون وے ہادی برحق نے بتایا تھا اس پر کسی نے ملاوٹ والا یوٹرن لے لیا کسی نے رشوت کی بریک لگا لی راقم کے گھر والے راقم کے بچے جب یہ باتیں سنتے ہیں تو پوچھتے ہیں؟ سرکارِ دو جہاں کی زندگی اس قدر مشکل تھی تو میں جواب دیتا ہوں رب نے تو ان سے پوچھا تھا احد پہاڑ کو سونے کا بنا دیتے ہیں اور جہاں جہاں آپ جائیں گے آپ کے ساتھ ساتھ چلے گا مگر امی جان عائشہؓ نے منظور نہ کیا کیوں؟ کیونکہ وہ زروجواہر اور خوان نعمت والے شعبہ ہائے زندگی کو قابل توجہ ہی نہ سمجھتے تھے -

☆☆☆☆☆

کہسار کا چاند

بشریٰ رحمٰن

چاند پھر طلوع ہوا ہے۔
میں سوچتی ہوں کاش یہ چاند اتنی پابندی سے طلوع ہونا بند کر دے۔ یہ بھی وقت اور زمانے کی طرح اپنی چال بھول جائے، تو پھر لوگ بھولی بسری باتوں پر غم کھانا بھی چھوڑ دیں۔ یہ جب طلوع ہوتا ہے تو کتنے ہی پرانے زخموں کے ٹانکے کھل جاتے ہیں۔ کتنے ہی درد بیدار ہو جاتے ہیں۔
ایک زندگی اتنے دکھ ___ اتنے رنج اُٹھا کر تھک جاتی ہے۔ جیتے جیتے تھک جاتی ہے۔ لیکن یہ چاند ___ یہ یونہی نکلتا رہتا ہے ___ ڈوبتا رہتا ہے۔
اے چاند!
تو کب تک یونہی نکلتا رہے گا۔ تجھے کبھی قرار نہ آئے گا؟ کچھ دیر کے لیے اپنا چلن بھول جا ___ دنیا سے روپوش ہو جا ___ تاکہ کالی اور اندھیری راتیں آ جائیں ___ ہوش بے ہوشی میں بدل جائے جو کچھ ہو چکا وہ ذہن سے مٹ جائے۔ جو ہو رہا ہے اُس کی خبر نہ رہے ___ کبھی تو یوں بلندیوں کی اوٹ سے جھانکنا بند کر دے۔
چاند پھر طلوع ہوا ہے ___ وہی پرانا اور خوبصورت چاند!
پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا چاند اُس

شریر بچے کی مانند دکھائی دے رہا ہے۔ جسے والدین باہر جاتے ہوئے ایک کمرے میں بند کر گئے ہیں۔ لیکن وہ موقعہ پا کر کمرے کی کھڑکیوں اور دریچوں سے جھانک کر کوئی نئی شرارت کرنا چاہتا ہے۔ کتنی حسین تاک جھانک ہے یہ!

اور لو__ وہ جھانکتا ہوا شریر بچہ منڈیر کے کنارے پر آ گیا۔ ماں باپ کا کلیجہ ڈول گیا ابھی گرا کہ گرا__ لیکن وہ تو منڈیر پھلانگ کر آسمان پر بھی جا پہنچا۔

اور کہسار کی آغوش سے نکل کر آسمان پر جانے والا چاند__ کہساروں کے قریب مسکاتا رہتا ہے۔ دھیرے سے انھیں چھو کر آگے نکل جاتا ہے۔ جیسے نیند کی ماتی آنکھوں کی ابھی پلک لگی ہو اور پھر کھل گئی ہو۔

یہ پیاسے پہاڑ ایک مدت سے اپنی دھندلائی ہوئی آنکھیں وا کیے چاند کے اس کھیل کو دیکھ رہے ہیں۔ جو ان سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی ان سے دور ہے۔ جو انھیں اپنے قریب لاتا ہے۔ پھر خود سرک کر دور ہو جاتا ہے۔ یہ قربتیں اور یہ فاصلے، شاید اس لیے ہیں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ اور چاند ان پہاڑوں کو پھلانگ کر اُدھر چلا جاتا ہے۔

چاند کو ایک دن جھکنا ہو گا__ ذرا سا جھکنا ہو گا__ جس طرف یہ پہاڑ اپنا منہ اُٹھائے کھڑے ہیں۔ اُس طرف چاند کو اپنا چہرہ جھکانا پڑے گا۔ تاکہ دونوں اپنی اپنی منزل میں گم ہو جائیں۔ چاند چاہے کتنا ہی منا سا کیوں نہ ہو وہ تو بلندیوں پر کھڑا ہے۔ پہاڑ کتنے ہی وسیع و عریض کیوں نہ ہوں وہ پستیوں کے مکین ہیں پستیاں ہمیشہ منہ اُٹھائے بلندیوں کی طرف تکا کرتی ہیں۔ بلندیوں کا تعاقب کرتی ہیں۔ بلندیاں اتنا کیوں نہیں کرتیں کہ پستیوں کو ہم آغوش کرنے کے لیے تھوڑا سا جھک جائیں۔ چاند کہساروں کے سرمئی لب چھو کر نکل جائے۔ چاندنی سفیدے کے درختوں سے لپٹ کر امر ہو جائے۔ اور پہاڑ اپنی حالت پر آنسو بہانا اور آہیں بھرنا چھوڑ دیں۔

ہاں چاند بھی آہستہ آہستہ نیچے کی طرف آ رہا ہے۔ وہ جھک جائے گا۔ اگر کوہساروں کے پتھر ایسے جگر پاش پاس نہ ہوئے تو کیا ہو گا؟

"زلیخا!"

"ہوں"

"پھر چاند کو تک رہی ہو؟"

"پھر کیا کروں__؟"

"مجھے دیکھو!"

"کیا تم چاند ہو__؟" "چاند تو نہیں انسان ضرور ہوں۔"

"انسان پتھر دل ہوتے ہیں۔ اس لیے میں چاند کو تکا کرتی ہوں۔"

"اور چاند بھی تو بے حس ہوتا ہے۔"

"وہ بہت دور ہے۔ میں اُس کی بے حسی

کہاں محسوس کر سکتی ہوں؟"

"تم میری طرف نہیں دیکھو گی ___"

میں اُدھر کو مڑ گئی۔ "دیکھو نا سفیدے کے خاموش درختوں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا روشن روشن چاند، کتنا حسین ___ کتنا انوکھا لگ رہا ہے۔

"زلیخا! تم چاند کو مت دیکھا کرو۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ چاند بہت بلند ہوتا ہے۔ اور تم خود بہت بلند ہو ___ اور جب بلندیاں بلندیوں کی طرف مائل ہوتی ہیں تو انسانوں کے لیے پناہ نہیں رہتی۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے گرہ میں باندھ لیا جائے۔ کیا مجھے بلند ہونے کا طعنہ دے کر تمھارے کسی جذبے کی تسکین ہوتی ہے۔ پھر ٹھیک ہے کہے جاؤ ایسا ہی ___"

"تم اسے طنز کیوں سمجھتی ہو زلیخا؟ یقین جانو جب بھی پہاڑوں کی اوٹ سے چاند نکلتا ہے۔ سفیدے کی شاخیں اُسے اپنے حلقے میں لے لینے کو بے قرار نظر آتی ہے۔ تمھاری نظریں آسمان سے نہیں ہٹتیں۔ میں ڈرتا ہوں۔ تم زمین کی طرف دیکھا کرو۔ زمین پر انسان رہتے ہیں۔ میرے جیسے انسان، جن کے دلوں میں آرزوئیں، ارمان، خود غرضیاں اور ہزاروں فریب ہیں۔ آسمان پر کیا ہے۔ بے حس چاند ___ ٹھوس سیارے اور خیالات میں گم گشتہ کا مرکز آسمان اور ___"

"اور آسمان پر خدا ہے۔ جو بیٹھا اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔ اُن کی باتیں سن رہا ہے۔ جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے اور جس کی طرف آخر کار ہم کو لوٹ کر جانا ہے۔"

"فلسفہ بگھارتی ہو ___ میں تم سے یہ کہنے آیا تھا دیکھو آج رات کتنی حسین ہے ___ رات کا یہ فتیلہ حسن کتنی ان کہی کہانیاں کہہ رہا ہے۔"

"کہسار کی ہر رات حسین ہوتی ہے۔ وہ شب ماہتاب ہو یا شب دیجور۔ اندھیروں میں لپٹے ہوئے فلک بوس پہاڑ ایک پُر اسرار سا محل معلوم ہوتے ہیں۔ جس کا کوئی پھاٹک اور جس کے پھاٹک کا سراغ لگانے کی کوئی شہزادہ آج تک ہمت نہیں کر سکا۔ اُس وقت آسمان روشن ہوتا ہے کیونکہ اُس کے دامن میں بہت سیارے ہیں۔ پہاڑ اور بھی سرمئی ہو جاتے ہیں کیونکہ اُن کی آغوش میں ٹمٹمانے والے ستارے رات کو بجھ جاتے ہیں اور میں کہساروں کی ہر ہوش رُبا رات میں کھوئی رہتی ہوں......"

عامر کو مجھ سے ہمیشہ یہی شکوہ رہتا ہے کہ میں بلندیوں کی طرف دیکھتی ہوں اور مجھے بلندیوں پر پرواز کرنے کا جنون ہے۔

عامر چند دنوں سے یہاں آیا ہوا ہے۔ میں یہیں پیدا ہوئی ہوں۔ میں ان اونچے اونچے پہاڑوں کی آغوش میں پیدا ہوئی۔ ان

مرغزاروں اور سبزہ زاروں میں میں نے سانس لی__ ان اونچی نیچی گھاٹیوں میں زندگی کے کئی خواب دیکھے۔ یہ بلندیاں__ ہر لحظہ اوپر و دیکھتے ہوئے پہاڑ میری روح میں رچ بس گئے ہیں۔

یہ حقیقت ہے مجھے تنگ و تاریک راستوں اور اندھیری گھاٹیوں سے ڈر لگتا ہے۔ جب ان گہری گھاٹیوں کو سبزہ اپنی آغوش میں چھپا لیتا ہے تو میں اطمینان کا سانس لیتی ہوں۔

میرے اللہ! اگر ان گھاٹیوں اور گہرائیوں میں یہ گھنے درخت اور خودرو پودے نہ اُگا کرتے۔ تو یہ کتنی بھیانک اور خونخوار دکھائی دیتیں۔

اس میں میرا کیا قصور تھا عامر__ تم کہاں سے آ گئے ہو مجھے بات بات میں طعنہ دینے والے۔

''زلیخا''

''جی''

''کیا کر رہی ہو؟''

''دن میں کوئی چاند نہیں نکلتا۔''

''تو میری طرف دیکھو'' وہ نیچے ڈھلوان میں کھڑا تھا۔ میں نے آگے ہو کر اُسے جھانکا۔

''ادھر آ جائیے، سہارا دوں__؟''

''ایک شرط پہ......''

''کیا......؟''

''سہارا ابدی ہو گا اور تمھیں بھی تھوڑا سا جھکنا پڑے گا۔''

میں سوچ میں پڑ گئی۔

''نہ جھک سکو گی؟''

میں خاموش رہی۔

''زلیخا! جو اپنی زندگی میں کسی ایک کے آگے جھک نہیں سکتا۔ وہ زندگی کے حقیقی رنگ کو پا بھی نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں تم بہت ہی بلند لڑکی ہو۔ مقدس اور حسین سی__ تم اونچے اونچے پہاڑوں اور مصفا ہواؤں میں پروان چڑھی ہو۔ لیکن میں تو پستیوں کا باشندہ ہوں۔ تمھارے دیس میں جانے کیوں اور کہاں سے آ گیا ہوں۔ بلندیوں تک جانے کی ہمت نہیں__ دل میں کتنے ہی ارمان رکھتا ہوں۔ بلندیوں کو اپنی طرف جھکاتا ہوں ایک بار تم جھک آؤ۔ میں زندگی بھر کے لیے جھک جاؤں گا۔''

''عامر__!'' میرا دل دھڑکنے لگا۔ یہ کونسی آواز تھی۔ یہ کس کی آواز تھی۔ یہ گھاٹیوں میں کون بول رہا تھا۔ میں تو پہروں چاند کی سمت تکتی رہتی تھی۔ میں نے تو ایسی ہی آواز چاند کے نگر سے سننے کی تمنا کی تھی۔ پستیاں کیا ایسی بلند آواز میں بات کر سکتی ہیں__ پستیاں کیا اتنی حسین ہو سکتی ہیں؟ تو میں ناحق بلندیوں کی طرف مائل رہی۔

''عامر......'' میرا دل اور بھی تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''عامر__ میں تمھاری طرف جھک آتی ہوں۔ میں تمھیں سہارا دیتی ہوں۔ لیکن خدا

کے لیے مجھے اتنا مت جھکانا کہ میں روندی ہوئی ایک راہ گزر بن جاؤں۔"

میں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ عامر اُس کا سہارا لے کے اوپر آ گیا۔ میرا کیا سہارا بلکہ وہی مجھے سہارا دیئے ہوئے تھا۔ اوپر آ کر اس نے دھیرے سے اپنے ہونٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

میری پلکیں آہستگی سے جھک گئیں۔

یہ چاند تھا آسمان پر طلوع ہونے والا، جس کے لب میرے ہاتھ کو چھو رہے تھے۔ جس کا لمس خلا کو گنگنانے والی چاندنی سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

پھر میرے ہونٹ آپ ہی آپ مسکرا دیئے اور چاندنی میرے اردگرد عجیب سا جال بننے لگی۔

"عامر! تم اب تک کہاں تھے؟ پھر تو نہ کہیں چلے جاؤ گے۔"

"میں یہیں تھا تمھارے پاس..... پر تم چاند کی دنیا میں مگن تھیں۔ مجھے ڈھونڈنے میں تمھیں دیر لگی۔"

"چاند کی روشنی نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ میں تمھیں ڈھونڈ نہ سکی۔ میں دن کے بے باک اُجالوں کی شکر گزار ہوں۔ جہاں تم مجھے نظر آ گئے۔ اور ان پستیوں کی جن کی آغوش میں کھڑے ہو کر تم نے مجھے پکارا۔"

"زلیخا!"

"عامر؟"

"تم کہسار کی پیشانی سے طلوع ہونے والا چاند ہو!"

"اور تم ___؟"

"اور میں ___ میں وہ پیاسا پہاڑ ہوں جو سارا دن آسمان کی جانب اُٹھائے چاند کے طلوع ہونے کا انتظار کرتا ہے۔ اور جب بے نیازی سا چاند دھیرے سے اُس کی پلکیں چھو کر دور نکل جاتا ہے۔ تو اُس کے سارے خواب ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ تمام رات اُس چاند کی سمت دیکھتے ہوئے گزار دیتا ہے۔ اور کبھی دور دور رہنے والا چاند اسی پہاڑ کی نظروں کی تاب نہ لا کر جلد چھپ جاتا ہے اور کبھی اُس کی نظروں کی گرمی سے پگھل کر چاند بدنما ہو جاتا ہے۔ کبھی گھٹتا ہے کبھی بڑھتا ہے.....؟

"عامر! تم چاند سے بہت قریب رہتے ہو۔ تم چاند کو بس میں کیوں نہیں کر لیتے؟"

"چاند کو تھوڑا سا جھکنا ہو گا۔ بس ذرا سا ___ میرے اور اُس کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ ہے وہ اگر جھک آئے تو میں اُسے پکڑ کر اپنے دل، اپنی آنکھوں اور اپنی سانسوں میں بسا لوں ___"

"زلیخا!" عامر نے میرے بالوں میں منہ چھپا کر سرگوشی کی۔

"چاند میری خاطر جھکے گا تھوڑا سا۔"

"ہاں عامر ___" میں نے رُک کر کہا۔

"تو میری پیشانی پر جھک آئے ___ میری آنکھوں پر ___ میرے ہونٹوں پر ___"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''عامر......'' میں شرما کر اندر بھاگ آئی۔
اتنا نہ جھکاؤ چاند کو کہ اوپر جانا ہی بھول جائے۔ میری زندگی اپنا طریقہ بھول گئی۔
چاند نے پہاڑوں کی طرف جھکنا شروع کر دیا۔ پہاڑ وا اپنی جگہ پر اٹل تھے......
اُن کے پاؤں میں تو ازل سے بیڑیاں تھیں__ پتھر کی سخت اور سرد بیڑیاں جنھیں وقت کا کوئی بھی ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ اس لیے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے کوئی بھی نہیں ہلا سکا ہے۔ اگر کوئی کوہکن پیدا بھی ہوا تو بالآخر اُسے تیشہ اپنے ہی سر پر لگانا پڑا۔ چاند کے نرم و نازک مہک پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ وہ بس اپنے اصولوں کا پابند ہے۔ دھیرے سے آتا ہے، دھیرے سے چلا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی مرضی سے جھک آتا ہے، کسی کی پیشانی پر__ کسی کی آنکھوں میں__ کسی کے ہونٹوں پر...... کہسار اور چاند اپنا اپنا کھیل کھیلتے ہیں...... یہاں پہاڑوں پر ایسے کھیل ہر رات رچائے جاتے ہیں۔ پہاڑ ہر رات چاند کو نیچے جھکانے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ اور چاند ہر رات اُن کے سرد ہونٹوں کو چھو کر آگے نکل جاتا ہے۔
''چاند! تو جانتا ہے۔ یہ پہاڑ تجھے جھکاتے جائیں گے۔ اتنا کہ تجھے پاؤں تلے روند دیں گے۔ اور خود اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلیں گے۔ کیونکہ یہ سرد پتھروں سے بنے ہیں۔ انھیں کوئی حدت کوئی گرمی نہیں پگھلا سکتی۔ بلکہ برف بھی ان کے سینوں پر پڑی پڑی پگھل جاتی ہے۔
اور اے چاند!
جب تو آہستہ خرامی کے ساتھ ان کی طرف جھکنے پر آمادہ نظر آتا ہے، تو میرا دل خون ہونے لگتا ہے اور میں بلند آواز سے کہتی ہوں۔
اے بادلوں کے لاڈلے!
جا__ لیکن ان پہاڑوں کے قریب نہ جا__ ان سے نہ ٹکرا__ چاند کا مسکن تو آسمان ہے۔ چاند زمین پر اچھا نہیں لگتا__ اور پہاڑ اتنے مضبوط ہیں کہ کوئی بھی ان کا بال بھیکا نہیں کر سکتا۔ تیرے ننھے سے وجود کی کیا بساط__؟
چاند اور پہاڑ کا یہ کھیل زندگی سے قریب ہوتا گیا۔
چاند جھکتا آیا، پہاڑ اپنی جگہ پر اٹل رہے۔
عامر میری زندگی بن گیا۔ میں نے اپنی تمام تر روشنی اُس پر نچھاور کر دی۔
ہم اونچے اونچے پہاڑوں پر گھومے پھرے۔ دُور دُور چیڑ اور چنار کے درختوں کے جھنڈ میں کوئل کی اندوہگیں پکار سنی۔ جب بھی کوئل درد بھرے انداز میں کوکتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا، عامر مجھ سے کچھ اور قریب ہو گیا ہے۔ کوئل کی کوک میں جو درد تھا۔ وہ درد میرے دل میں اُٹھنے لگا۔ اور جہاں جہاں درد اُٹھتا وہیں عامر کی تشبیہ بنتی گئی۔

اور آخر میں ___ دل کی جگہ صرف عامر تھا۔
کیسے خوش آگیں تھے وہ لمحے!
''زلیخا ___!'' اُس کی ہر پکار مجھے آبشاروں کا خوبصورت گیت معلوم ہوتی۔ اُس سے پہلے جھرنے اور آبشار اتنی مترنم آواز میں نہ گونجا کرتے تھے۔
''میں تمھیں خالہ اماں سے مانگ کر جب اپنے دیس لے جاؤں گا تو پھر یہ چاند یہاں طلوع ہونا بند کر دے گا۔ تم جانتی ہو یہ پہاڑوں پر صرف تمھیں دیکھنے کے لیے آتا ہے۔''
''اور تم کسے دیکھنے کے لیے آئے ہو؟''
''جسے چاند دیکھتا ہے۔''
میں ہنس دی ___ ہلکی سی ہنسی۔
''کبھی کبھی جب تم ہنستی ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے چاندنی میں سوئی ہوئی پریوں نے ہوش رُبا قہقہہ لگایا ہو۔
''اور تمھارے دانت ___ چاندنی رات میں ستاروں کی کہکشاں ہیں۔ تم مجھے ہنستی ہوئی بہت اچھی معلوم ہوتی ہو۔''
''پھر دیکھو تم مجھے رُلا کر تو نہ چل دو گے۔ کیونکہ دُنیا کی ہر کہانی ہنسی سے شروع ہوتی ہے اور اور آنسوؤں پر ختم ہو جاتی ہے۔''
''ایسے توہمات تمھیں زیب نہیں دیتے ___ دیکھو۔''
''ہوں ___''
'میں اس بات پر اکثر مسرور رہتا ہوں کہ میں نے تمھارا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔''
''میں اس بات پر مسرور رہتی ہوں کہ میں نے تمھاری خاطر جھکنا سیکھ لیا ہے۔ مجھے عامر اب معلوم ہوا ہے۔ جھکنے میں جو مزہ ہے وہ سر اُٹھانے میں بالکل نہیں ___''
''زلیخا.....''
''ہوں۔''
''زلیخا.....''
''ہوں۔''
''زلیخا ___ زلیخا ___ زلیخا''
اللہ اللہ زمین کا ذرہ ذرہ زلیخا، زلیخا پکار رہا ہے۔ آسمان سے زمین تک زلیخا نام کی بارش ہو رہی ہے۔ یہ نام پھیل کر ساری کائنات میں سماتا چلا جا رہا ہے۔ یہ کون پکار رہا ہے مجھے؟ یہ کس نے میرا نام لیا ہے کہ میرا نام اتنا حسین بن گیا ہے۔ یہ میرے نام پر جادو کس نے کر دیا ہے!
سنا تم نے ___ چنار کے مدبھرے نشیلے سایو! میرا نام زلیخا ہے۔ اور تم مجھے زلیخا بلایا کرو۔
سنا تم نے ___ سفیدے کے معصوم اور اونچے درختو! مجھے کوئی کس پیار سے زلیخا کہتا ہے۔ تم بھی سرگوشی میں میرا نام پکارا کرو۔
اے اونچی نیچی گھاٹیو! روش روش پر میرا نام بکھیر دو۔ اے مہکتے پھولو، اور سرشار چنو! بولو ___ پکارو ___
میرا نام زلیخا ہے۔ اور یہ اتنا حسین نام ہے ___ اور عامر کے لبوں کی ملاوٹ میں گھل کر وہ اور بھی شیریں ہو گیا ہے۔ میرے سامنے سے

چاند کو ہٹادو__ کوئی جاؤ اور جا کر چاند کا نام زلیخا رکھ دو- تا کہ سارا زمانہ چاند کو زلیخا کہہ کر پکارے- اور میرا نام ایک زمانہ بن جائے__ ایک وقت__ ایک راگ-

عامر! تم نے یہ کس طرح میرا نام پکارا کہ میں اپنے ہی نام میں گم ہو کر رہ گئی- میں صرف زلیخا میں سما کر رہ گئی- اب میری سرشار آنکھوں کو مت کھولو!

"زلیخا__"

"جی......"

"آنکھیں کھولو...... کیا سوچ رہی ہو؟ اس وقت میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں-"

"کیا تم نے مجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟"

"یہ کہو میں نے تمہیں کب نہیں دیکھا- اب تو اپنے پر بھی تمہارا ہی گمان ہوتا ہے-"

"عامر......"

"زلیخا، چپکے سے ادھر آجاؤ- خالہ اماں جاگ پڑیں گی- چاند اب پہاڑوں کی اوٹ سے جھانک رہا ہے- اور ہم چناروں کی اوٹ میں بیٹھ کر چاند کو دیکھیں گے- ہے نا__؟"

"میں تمہیں دیکھوں گا، تم چاند کو دیکھنا__"

"عامر......"

"زلیخا__"

چناروں کے سائے، سفیدے کی لمبی ٹہنیاں__ چنبیل کی معطر شاخیں، یہ سب زلیخا زلیخا پکارتی رہیں، رس گھولتی رہیں- عامر ایک چٹان بن گیا اور چاند جھکتے جھکتے رستہ بھول گیا-

وہ تو چند دنوں کے لیے آیا تھا- اُسے ستانے کے لیے کوئی چھاؤں چاہیے تھی- زلیخا رات کی رانی کی معطر شاخ بن کر جھک گئی- مسافر ستایا اور چل دیا-

کوئی یوں بھی ستانے آتا ہے کہ کسی کا سب کچھ لے کر چلا جائے، کوئی یوں بھی کسی کے ارمانوں کا مضحکہ اڑاتا ہے- کوئی چاند کے چہرے کو گھائل کرتا ہے؟"

اس میں کس کی خطا تھی؟

چاند کا کام جھکنا تو نہیں__ پھر وہ نادان زمین کی طرف کیوں جھک آیا؟

کچھ دن پہلے عامر نے مجھے چمکتی ہوئی انگوٹھی پہنائی تھی اور اپنی زندگی کا ایک عظیم راز__ اپنی ایک لغزش کی داستان مجھے سنائی تھی- اور میرے قدموں پر جھک کر کہا تھا کہ میں اُس کی خطا کو کم سنی کہہ کر معاف کر دوں- اور اُسے سینے سے لگا کر بلندیوں پر لے جاؤں، ورنہ وہ ان گہرائیوں میں کود کر جان دے دے گا- اور میں نے اُسے مجبور سمجھ کر معاف کر دیا تھا کہ مرد کی جوانی لغزشوں سے پاک نہیں ہوتی- میں اُس کا اتنا بڑا قصور معاف کر بیٹھی- وہ مرد جو ہوا- کیا ہوا جو اُس نے جرمنی جا کر ایک حسین و جمیل عورت سے دل لگا لیا- اُس سے شادی کر لی- ایک بچی بھی ہوئی پھر عامر کو واپس

آنا پڑا___ لیکن اُس عورت نے آنے سے انکار کر دیا- وہ بے وفا نکلی اُس نے عامر کا دل توڑ دیا__ عامر یہاں آ کر بھی اُس کی منتیں کر کے اُسے بلاتا رہا- لیکن وہ ہر بار انکار کرتی رہی- اُسے اپنے حسن پر ناز تھا اور وہ جانتی تھی عامر پلکوں کے بل چل کر اُس کے پاس آئے گا- لیکن عامر ضد میں آ گیا- وہ زخم خوردہ تھا__ دل بہلانے کو مرغزاروں کوہساروں میں اپنی بھولی بسری خالہ کی جھونپڑی میں آ گیا-

یہاں اُسے زلیخا مل گئی- زلیخا__ جو جھونپڑی میں کھڑی ہو کر چاند کی طرف مائل پرواز تھی- دو مضبوط بازوؤں نے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا- وہ مجبور ہو گئی- اوپر جانا اب اُس کے بس کی بات نہ تھی-- وہ نیچے کی طرف آ گئی-

اور میں نے عامر کا یہ قصور معاف کر دیا- کون مرد ہے جو، جوانی میں پارسائی اختیار کرتا ہے- عامر کم سے کم اتنا صاف گو تو ہے کہ اس نے اپنی زندگی کی کتاب کھول کر میرے سامنے رکھ دی ہے- مجھ سے معافی مانگی ہے-

اور اب وہ مجھ ایسی لڑکی کو پا کر رینا کو، اُس کی بے وفائی کو بھول گیا ہے- وہ اُس واقعہ کو اپنی کم سنی کی لغزش سمجھ کر بھول گیا ہے- اور میں بھی بھول گئی ہوں-

میں نے ہمیشہ اس پہاڑی پر بیٹھ کر عامر کا انتظار کیا ہے- وہ کچھ بھی ہے اب وہ میرا ہے- اور میں نے اُس کے آلودہ دل کو زم زم سے دھو کر مصفا کر دیا ہے- اب اُس کے دل میں صرف زلیخا بستی ہے__ تم نے دیکھا نہیں جب وہ زلیخا پکارتا ہے تو ارض و سموات میں راگنیاں بج اُٹھتی ہیں- یہی خلوص کی صداقت بھی ہے اور محبت میں خود خدا مائل ہوتا ہے- میں اُس کی باتوں کو جھوٹ کیونکر مانوں؟

وہ مجھے انگوٹھی پہنا کر چلا گیا ہے- اب وہ نہایت کروفر کے ساتھ مجھے بیاہنے آئے گا- مجھے صرف ان پہاڑوں اور گھاٹیوں کے چھوٹ جانے کا غم ہے- میں نے اپنی ماں سے کہا ہے مجھے جہیز میں کچھ بھی مت دو__ سونا، کپڑا__ روپیہ کچھ نہیں__ اگر دے سکو تو میرے دیس کی یہ پہاڑی ہوائیں دے دو__ یہ سسکتے ہوئے لمبے لمبے شاہی مجنوں جیسے درخت اور آہیں بھرتے ہوئے پتے دے دو- ان وادیوں کا کچھ حسن دے دو__ اور وہ چاند دے دو جو کوہسار کی راتوں کا سہاگ بن کر ہر رات اپنے وقت پر چلا آتا ہے-

ہاں میری ماں! اور مجھے کچھ نہیں چاہیے- کیونکہ میں عامر کے گرم دیس میں جا رہی ہوں- سنا ہے وہاں حسن کے قدردان ہوتے ہیں- اور وہاں بھی زندگی بہت حسین بن جاتی ہے-

حسین زندگی کے خواب دیکھنے والو__ جاگو__ جاگ پڑو__ وقت ہر ایک کو

فریب دیتا ہے۔ لیکن اُس کا یہ مطلب تو نہیں آدمی ہر وقت فریب کھاتا رہے۔ بار بار کا دھوکا انسان کو مکار بنا دیتا ہے ___ ایک بار دھوکا کھا کر سنبھل جاؤ تاکہ تمہاری معصومیت خطرے میں نہ پڑے۔

ایسے ہی خوش آگیں دنوں میں ___ جب میں عامر کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کا ایک خط ملا۔

میری اپنی زلیخا!

میں تمھیں یہ خط عجیب تذبذب کے عالم میں لکھ رہا ہوں۔ میں سب کچھ نئے سرے سے تمھیں کیسے بتاؤں؟ کہ پہلے پہل جب میں نے تمھیں دیکھا تو تم میری زندگی کا مدعا بن گئیں۔ تم اتنی بلند اور مقدس تھیں کہ عرصہ تک تو میں تمھاری طرف نگاہ اُٹھانے کی جرأت بھی نہ کر سکا۔ میرے دل میں خواہشوں کا ایک طوفان جاگ اُٹھا۔ جب زندگی اجیرن ہونے کو آئی، میں نے تمھاری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اور اُس دن مجھے اپنی خوش قسمتی کا یقین ہو گیا۔ جب تم نے میرا ہاتھ تھا لیا۔ کوئی مجھ جیسا خوش قسمت روئے زمین پر نہ ہوگا۔ جس کی طرف چاند جھک آئے اور جسے چاند ایسا سہارا مل جائے۔

زلیخا! میں نے تمھیں قریب سے دیکھا۔ تمھارے دل میں جھانکا، تمھیں پرکھا ___ بار بار پرکھا ___ اور میں سٹپٹا گیا ___ تم میرے ہر اندازے اور ہر خیال سے بلند نکلیں ___ تب میں اپنے آپ کو فریب دیتا رہا ___ لیکن مجھے یہاں آ کر صحیح معنوں میں سوچنے کا موقع ملا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھ ایسے ہیچ آدمی کو تمھیں نہیں اپنانا چاہیے۔ تمھیں کوئی تمھارے جیسا بلند ہی انسان اپنانے کا حق رکھتا ہے۔ میں تمھیں اپنا کر مزید گنہگار نہیں بننا چاہتا ___ یوں بھی میں نے زندگی میں کوئی نیک کام نہیں کیا ___ میری زلیخا! میری اس خطا کو معاف کر دینا اور میرے اس قصور کو بھی کہ میں نے تمھیں پستیوں کی طرف لانا چاہا۔ میں سوچتا ہوں اس طرح شاید میرے گناہوں کی تلافی ہو سکے۔

مجھے اپنے گناہوں کی تلافی کرنے کا موقع دو۔ اور اس بلند انسان کا انتظار کرو۔ جو تمھارے شایانِ شان ہوگا۔

اور میں دعا کرتا ہوں کہ کوئی تمھارے جیسا انسان جلد آ کر تمھیں اپنا لے۔

تمھارا خطا کار ___ عامر

یہ بھی دھوکے کی ایک خوبصورت شکل ہے عامر! بلندیوں کو پستیوں کی طرف لا کر ٹھکرا دینا تاکہ وہ نہ اِدھر کی رہیں نہ اُدھر کی ___ میں نے تمھاری خاطر جھکنا گوارا کیا تھا ___ میں نے تمھارے ساتھ زندگی بتانے کا عہد کیا تھا۔ میں تمھاری ہو گئی تھی ___ تم کون تھے؟ تمھارا ماضی کیا تھا؟ اس سے مجھے کیا غرض؟

تم عورت کے دل سے واقف نہیں ہو___
اُس کا دل ایک بحرِ بیکراں ہے عامر___ وہ معمولی سے معمولی مرد کو بھی اپنے دل میں جگہ دے کر بلند کر دیتی ہے۔
عامر! تم نے میرا ظرف نہ آزمایا بلکہ اپنی تنگ ظرفی کا ثبوت دیا۔ ایک بار لوٹ آؤ۔ میں تمھیں گلے سے لگا کر اس احساس کمتری کا ازالہ کر دیتی ہوں___ مجھے کسی اور کا انتظار نہیں___ اب یہاں کوئی اور نہیں آئے گا__ مجھے صرف تمھارا انتظار تھا۔ یوں مجھ سے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔
لیکن یہ پہیلی تو کچھ دنوں بعد خود بخود کھل گئی۔ جب میرے خط کے جواب میں عامرہ نے لکھا۔
بھیا آج کل پھولے نہیں سماتے۔ کراچی چلے گئے ہیں۔ کیونکہ ایک ماہ ہوا اُن کی ریٹا یہاں آ گئی ہے۔ انھوں نے وہاں ایک خوبصورت بنگلہ لے لیا ہے۔ اُن کی بچی راضی بہت پیاری ہے۔ خط لکھوں گی تو تمھارا پیغام لکھ دوں گی۔
اوہ___ عامر! تمھیں اتنا خوبصورت جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ تم نے کہہ کیوں نہ دیا کہ تم نے صرف دل بہلانے کو آسرا ڈھونڈا تھا۔ تم نے مجھے بلند سمجھ کر نہیں ٹھکرایا بلکہ میری بلندیوں کا مضحکہ اڑایا ہے۔ بلند تو تمھاری ریٹا تھی جس کے آنے پر تم نے زلیخا کو ٹھکرا دیا۔
کتنا خوبصورت بہانہ تراشا ہے تم نے___ اس کی بھی کیا ضرورت تھی؟ میں تمھیں قصوروار نہیں کہتی___ یہ سب میرے مقدر میں تھا۔ اور اگر میں انسان شناس ہوتی تو فریب کیوں کھاتی۔
اب میں اوپر کو نہیں اُڑ سکتی__ چاند کی طرف نہیں دیکھتی__ اب مجھے اپنی بلندیوں پر ناز نہیں ہے__ مجھے کسی اجنبی کا انتظار بھی نہیں۔
زمانہ آگے کو سرک آیا ہے۔ پہاڑ اپنی جگہ پر اٹل کھڑے ہیں۔ لیکن یہ چاند اب بھی اُسی طرح نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔ پہاڑوں کے سرمئی لب چھو کر آگے نکل جاتا ہے۔ ٹھیک ہے، اُسے پہاڑوں کے تشنہ لبوں کو سیراب نہیں کرنا چاہیے۔ چاند کا وطن تو آسمان ہے۔ اور یہ پہاڑ کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں___ زمین کے باسی ہیں۔
لیکن کبھی ایسا ہوتا کہ چاند طلوع ہونا بھول جائے۔ دنیا اندھیرے کی چادر میں کھو جائے۔ اور میں وہ سب کچھ کسی انجانی جگہ پر رکھ کر بھول جاؤں۔ جسے ایک مدت سے اپنے کندھوں پر اُٹھائے چلی آ رہی ہوں۔ ایسی جگہ رکھ کہ ڈھونڈے سے نہ ملے۔
اور میں وہی زلیخا بن جاؤں___ الھڑ___ اجنبی___ جو___ چاند کو تکا کرتی تھی۔
صرف چاند کو___!!

☆☆☆☆☆

نکتہ

اِس امید پر کہ شاید لکھ دینے سے ہی اس منظر کا دُکھ مِٹ سکے، میں اسے تحریر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ منظر جو میں نے آج سے ساٹھ سال پہلے دیکھا تھا، دِل پر ایک زخم کے نشان کی طرح ثبت ہے۔ اور کبھی کبھی میری آنکھوں کے سامنے پوری جزیات کے ساتھ اس طرح آن کھڑا ہوتا ہے جیسے میں ابھی ابھی اس میں سے گزر کر آ رہا ہوں۔ حالانکہ مجھے پاکستان سے جرمنی ہجرت کئے ہوئے بھی اکتالیس سال بیت چکے ہیں۔ ویسے میں نے بیس سال پہلے بھی ایک بار اپنے بیٹے کے ساتھ اس منظر کی المناکی شیئر کر کے رنجیدگی کی اس گھمبیرتا سے جان چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ تب میں خود اڑتالیس سال جی چکا تھا اور میرے بیٹے کی عُمر بائیس سال تھی۔ لیکن اصل واقعہ کے وقت تو میں صرف آٹھ سال کا تھا۔

ہماری رہائش ماڈل ٹاؤن لاہور کے جے بلاک میں تھی اور میں رحمانیہ پرائمری سکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ ہم ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے ننھیال جایا کرتے تھے۔ میرا ننھیال گوجرہ شہر سے چند کلومیٹر دُور چک نمبر 297 میں تھا۔ میرے نانا اور ماموں تقسیم مُلک کے وقت اپنے آبائی وطن لدھیانہ سے ہجرت کر کے وہاں آن بسے تھے۔ وہاں اب اُن کی چھوٹی سی زمینداری تھی۔ ماڈل ٹاؤن کے نسبتاً محدود ماحول سے نکل کر وہاں کُھلے کھیتوں میں گھومنا پھرنا، ''کھالوں'' میں نہانا اور بھینسوں بیلوں کے ساتھ کھیلنا، وہاں پر میرے ایسے مشاغل تھے جن کی وجہ سے میں وہاں جانے کے لئے ہمیشہ پُر جوش رہتا تھا۔ والدہ کے علاوہ میری دو بہنیں، ایک مجھ سے بڑی اور ایک چھوٹی اس سفر میں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ بڑے بھائی جو یوں بھی مجھ سے دس سال بڑے تھے والد صاحب کے ساتھ ماڈل ٹاؤن میں ہی قیام کرتے۔ ویسے بھی ، چاہے چھٹیاں ہی کیوں نہ ہوں، اُن کا دھیان پڑھائی ہی میں ہوتا تھا۔ وہ ہمیں ٹرین میں بٹھانے کے لئے صرف ریلوے اسٹیشن لاہور تک آیا کرتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی بھی ننھیال

رشی خان

جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُن دنوں گوجرہ تک ٹرین کا سفر کافی لمبا ہوا کرتا تھا۔ گوجرہ ریلوے اسٹیشن سے چک 297 تک کا سفر ہم کرائے کے تانگے پر کرتے۔ جو ایک بڑا حصّہ پکّی سڑک پر چلنے کے بعد کچّے راستے سے میرے ننھیال پہنچتا۔ یہ کچّے راستے کا سفر کافی تکلیف دہ ہوا کرتا تھا۔

اُس دن بھی وہاں جاتے ہوئے میں سامان کے ساتھ حسبِ معمول تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ والدہ اور دونوں بہنیں پچھلی نشست پر تھیں۔ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ مجھے سامنے کا منظر صاف نظر آتا۔ کچّے راستے سے گزرتے ہوئے، جس کے ایک طرف نہری پانی کا نالہ گزرتا تھا اور آس پاس سب لہلہاتے سرسبز کھیت ہوتے تھے، جونہی ہم گاؤں میں داخل ہونے لگتے تو دائیں طرف ایک چھوٹا سا آموں کا باغ آتا تھا۔ باغ سے ذرا آگے ایک بڑا سا برگد کا پیڑ تھا۔ گاؤں کے آغاز میں ہی نہر کے ساتھ بائیں طرف ایک کنواں ہوتا تھا۔ اُس دن سے پہلے میں نے کبھی اس کنویں کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ دراصل وہ میرے کھیل کود اور آوارہ گردی کے علاقے سے باہر تھا۔

اُس روز گاؤں میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ اُس کنویں کے آس پاس چادریں ٹانگ کر پردہ کیا ہوا ہے۔ وہاں چھوٹے بڑے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ تانگے کے وہاں سے گزرتے گزرتے جو میں نے دیکھا وہ کچھ یوں تھا۔ پردے کے پیچھے ایک چارپائی پڑی تھی جس پر شاید کوئی لیٹا ہوا تھا مگر اُس پر بھی چادر پڑی تھی۔ قریب ہی ایک تقریباً چالیس سال کی عمر کی عورت بین کر رہی تھی۔ اُس کے پہلو میں میری عُمر کے دو بچے سہمے کھڑے تھے۔ شاید اُن کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ دو تین گز کے فاصلے پر کھڑا ایک مرد اُس عورت کو گالیاں دے رہا تھا۔ تانگہ آگے میرے نانا کے گھر کی طرف بڑھ گیا اور میں مزید کچھ نہ دیکھ سکا۔ گھر پہنچ کر میں نے چاہا کہ والدہ کسی سے پوچھ کر مجھے بتائیں، کنویں کے پاس کیا معاملہ تھا لیکن انہوں نے مجھے ڈانٹ کر چُپ کرا دیا۔ پھر میں اپنے کھیل کود میں مصروف ہو گیا اور وقتی طور پر اُسے بھول گیا۔ آج سوچتا ہوں تو لگتا ہے والدہ کو گھر پہنچتے ہی اصل حقیقت کی خبر مل گئی تھی۔

دوسرے دن جب میں کچھ اور لڑکوں کے ساتھ مل کر اُس گھنے برگد کے نیچے کھیل رہا تھا تو میں نے ساتھ کھیلتے ہوئے ایک لڑکے

سے گزشتہ کل کے واقعہ کے بارے پوچھا۔ وہ لڑکا جو عمر میں مجھ سے تین چار سال بڑا تھا پہلے تو حیران ہوا کہ مجھے کیوں اصل بات کا علم نہیں؟ پھر مجھے اُس نے بتایا کہ کل وہاں گاؤں کی ایک نوجوان لڑکی کنویں میں کود کر مرگئی۔ بڑی مشکل سے اُسے نکالا گیا۔ چار پائی پر اُس کی لاش پڑی تھی۔ بین کرتی ہوئی عورت اُس لڑکی کی ماں تھی۔ اُس کے پاس کھڑے دونوں بچے اُس لڑکی کے بھائی تھے۔ اُس عورت کو گالیاں دیتا ہوا مرد اُس لڑکی کا باپ تھا۔ ''لیکن وہ کنویں میں کیوں کودی؟'' کے جواب میں اُس نے بتایا کہ لڑکی کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی وہ حاملہ تھی اور اب اُس کا پیٹ بھی نظر آنا شروع ہوگیا تھا۔ یہ بتا کر وہ کھیل میں یوں مصروف ہوگیا جیسے اس موضوع پر کچھ اور کہنے سُننے کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ اور اُس کے نزدیک تو تھی بھی نہیں۔

دیہاتوں کے رہنے والے لڑکے لڑکیوں کا تو بچپن ہی گائے بھینسوں کے درمیان شروع ہوتا تھا۔ انہیں تو اوائل عمر سے ہی جانوروں کے افزائشِ نسل کے مراحل کا علم ہو جاتا تھا اور یہ بھی کہ انسانوں کے معاملات بھی ان سے مختلف نہیں ہیں۔ لیکن میں تو کیا شہروں کے بچوں کو تو جوانی چھونے پر بھی انسانوں کے تخلیقی عمل کے مدارج کی کچھ خبر نہیں ہوتی تھی۔ تعلیمی معاملات میں بھی یہ سب شجر ممنوعہ تھا۔ سو مجھے بھی اُس وقت اُس لڑکی کے ''حمل'' کا مسئلہ کچھ سمجھ نہ آیا۔ مگر میں نے مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کی۔

وقت کے ساتھ ساتھ معلومات میں اضافہ ہوتا رہا، اُس لڑکی کے بارے میرا دُکھ بھی پھولتا پھلتا رہا اور میں ہمیشہ یہ سوچتا رہتا کہ کیوں اُس وقت وہاں کوئی عبدالستار ایدھی یا ایسا ادارہ نہیں تھا جو اُس لڑکی کی زندگی بچا سکتا؟ یہاں تک کہ اصل واقعہ کے چالیس سال بعد میں نے یہ آزار اپنے جوان بیٹے سے شیئر کیا۔ میرا بیٹا جو تین سال کی عمر میں جرمنی آیا تھا اور جس نے ابتدائی جماعتوں میں ہی انسانی فزیالوجی کے بنیادی اسباق پڑھ لئے تھے، بولا ''سارا قصور اُس لڑکے کا تھا، وہ جو اُس کا پارٹنر تھا۔ یقیناً وہ اپنے ماحول، رسم و رواج اور قوانین سے واقف ہوگا۔ اُسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ قانونِ فطرت کا شادی ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر وہ حفاظتی تدابیر استعمال کر لیتا تو اُس بے چاری لڑکی کو خودکشی نہ کرنا پڑتی''۔

☆☆☆☆☆

ادھوری کہانیوں کا نوحہ

حبیب الرحمٰن

دن کا بہت سا حصہ گزر جانے کے باوجود کمرے میں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ پردوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی روشنی کی ایک لکیر کھڑکی کے پاس دھرے میز پر پڑے بے ترتیب کاغذوں پر دم توڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ادھ لکھے صفحوں کے پاس کچھ کتابیں اور کافی کا ایک مگ تھا جس میں دھری کافی جانے کب سے پڑی پڑی بساند چھوڑنے لگی تھی۔ تاریک کمرے کے ایک کونے میں کتابوں سے اٹی ایک الماری تھی جس میں کتابوں کے علاوہ کئی ایوارڈ بڑی خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے۔ کمرے کے درمیان ایک بیڈ تھا جس کی چادر شکن آلود تھی اور اس پر دو تکیے بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے۔ بستر کے ساتھ ہی فرش پر ایک کمبل گرا ہوا تھا۔

میز پر پڑے کاغذوں پر ادھ لکھی کہانیاں پچھلے کئی دنوں سے اپنے انجام سے بے خبر لکھاری کی منتظر تھیں جو اچانک سے کہیں غائب ہو گیا تھا۔ کئی کہانیاں بالکل ابتدائی مرحل میں تھیں اور کچھ کسی بہت ہی دلچسپ موڑ پر کھڑی لکھاری کی منتظر تھیں۔ ہر کہانی ایک علیحدہ مزاج کی مالک تھی اور شائد یہی وجہ تھی کہ لکھاری کے ہوتے ہوئے ان کا ایک دوسرے سے تعلق بنا اور

نہ ہی کبھی انہوں نے آپس میں مل بیٹھ کر اپنے دکھ بانٹنے کی کوشش کی۔

پچھلے کئی سالوں سے اس نیم تاریک کمرے میں لکھاری کافی کے گھونٹ بھرتے اور سگریٹ سلگاتے کاغذوں پہ لفظ پرو کر کہانیوں کو جنم دیتا آیا تھا۔ اسے ادھ لکھی کہانیوں سے عشق تھا جنہیں وہ ہر پل سوچتا اور ان کے درمیان رہ کر خود کو کہانی کے ہر کردار کے ساتھ جیتا جاگتا محسوس کرتا۔

اسے کتابوں تک پہنچ جانے والی کہانیاں یاد کر کے الجھن ہوتی ۔ اسے لگتا کہ کتابوں تک پہنچ جانے والی کہانیاں اب اس کی دسترس میں نہیں رہیں اور اب وہ کتابوں میں دفن ہو گئی ہیں۔

ہم جیتی جاگتی کہانیاں ہیں -- تنہائی کی ڈسی کہانیاں لکھاری کی غیر حاضری کے کئی دنوں بعد آخرکار اک دوجے سے ہمکلام ہو ہی گئیں۔

پتہ نہیں میں کہانی ہوں بھی یا نہیں --- میز پر سب سے اوپر پڑا کاغذ دھیمی آواز سے اپنی بپتا سنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ---- لکھاری پچھلے کئی دنوں سے مجھ پر آڑھی ترچھی لکیریں لگاتا اور کچھ لکھ کر کاٹ دیتا تھا۔ مجھے کئی بار لگتا ہے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ کہتے ہوئے ڈرتا تھا اس لیے مجھے اب یہ لکیریں جسم پر لگے گھاؤ کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی انہیں دیکھ کر ان بے ترتیب لکیروں کے پیچھے چھپے لکھاری کے دکھ کو جان سکے ----- یہ بھی

تو ہو سکتا ہے کہ کہانی کار لوٹ آئے اور تمہیں ایک ایسا روپ دے کے سب عش عش کر اٹھیں -- پاس ہی پڑی ادھوری کہانی دلاسہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی

مجھے اس نے فارغ آدمی کا نام دیا تھا --- ادھوری کہانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی ----- میں ایک ایسے شخص کی کہانی ہوں جو بظاہر بہت مصروف نظر آتا تھا۔ ایک ایسا شخص جو امتحان کی وجہ سے اپنی ماں کے جنازے میں نہ جا سکا --- ایک ایسا آدمی جو اپنی شادی والے دن بھی وہ کسی بزنس ڈیل میں مصروف تھا -- ایک ایسا باپ جو زندگی بھر اپنی اکلوتی بیٹی کی سالگرہ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے شرکت نہیں کر سکا --- ایک ایسا شوہر جو زندگی کے جھمیلوں میں اپنی بیوی کی تیمارداری کر سکا نہ اس کی موت کا ماتم ۔ ایک ایسے شخص کی کہانی جسے آگے بڑھنا تھا اور جو آگے بڑھتے بڑھتے بالکل اکیلا ہو گیا۔ --- اس شخص کو بہت دیر بعد احساس ہوا کہ وہ کبھی بھی اتنا مصروف نہیں تھا -- اسے لگا جیسے اس کی ترجیحات غلط تھیں --- وہ تو ہمیشہ سے فارغ تھا --- اس نے سب کچھ حاصل کرنے کی تگ ودو میں وہ سب ضائع کر دیا ہے جو زیادہ قیمتی تھا -- اسے بہت دیر بعد احساس ہوا کہ اس نے زندگی ضائع کر دی ہے --

پھر --- پاس پڑی ایک کہانی استفسار کرتے ہوئے بولی --- پھر پتہ

نہیں--- آگے لکھاری نے کچھ لکھ کر کاٹ دیا ہے پتہ نہیں کہانی مکمل بھی ہے یا نہیں شائد وہ کچھ اور لکھنا چاہتا تھا---

لکھاری ہوتا تو شائد میں تم سب سے توانا کہانی ہوتیں--- پاس پڑی ایک کہانی دکھی لہجے میں بولی۔

ہم سب ایک مرحلے پر رک گئی ہیں --- ہمارے اختیار میں اپنے آپ کو مکمل کرنا نہیں--- کھڑکی کی درز سے ہلکی سی ہوا کی سرسراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک کہانی سسکاری بھرتے ہوئے بولی - -- مجھے نہیں پتہ کہ لکھاری کیا کہنا چاہتا تھا لیکن میں ایک ایسے شخص کی کہانی ہوں جو کسی کو نظر نہیں آتا تھا---

جادو ٹونے سے متعلق ہے --- ایک اور کہانی نے پوچھا---

نامکمل کہانی خود کہاں جانتی ہے جو لکھاری کے من میں تھا--- کہانی نے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی--- یہ کہانی ایک ایسے جیتے جاگتے شخص کی ہے جو اچانک سے لوگوں کو نظر آنا ختم ہو گیا تھا۔ کچھ دن تک تو وہ یہ جان ہی نہیں سکا کہ وہ اب کسی کو نظر نہیں آتا لیکن جب اس کے چاہنے والے پوتے اور بیٹے کو بھی اس کی خبر ہونا ختم ہو گئی تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ اب کسی کو نظر نہیں آتا۔ گھر میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی ناکام کوشش کے بعد ایک دن وہ گھر سے نکلا تو گلی کا چوکیدار تک اس کی موجودگی کا احساس نہ کر سکا۔ حالانکہ وہی چوکیدار کچھ ہی عرصہ پہلے اسے آتے جاتے دیکھ کر اس زور سے سیلوٹ مارتا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکان پھیل جاتی - وہی دفتر جس کا نظام اس کے خیال میں اس کے بغیر ایک دن بھی نہ چل سکتا تھا اس کے بنا بھی کسی مسئلے سے دوچار نہ ہو سکا تھا۔ پہلے وہ کبھی چھٹی کرتا تو دفتر سے دس فون آتے لیکن اب وہ کتنے ہی دنوں سے وہ دفتر سے آنے والی کال کا منتظر رہنے کے بعد ٹوٹ پھوٹ سا گیا تھا۔ اس کا بہت جی چاہتا کہ کوئی اسے فون کر کے ایک بار تو کہے کہ ملک صاحب آپ کے بغیر دفتر نہیں چلتا--- لیکن ایسا ہوا نہیں------

پھر --- ساتھ پڑی کہانی نے دھیرے سے پوچھا لیکن یہ کہانی بھی ادھوری تھی اپنے انجام سے بے خبر---

رات کا اندھیرا اب کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا اور پردے کے پیچھے سے آنے والی روشنی تاریکی میں گم ہو گئی تھی۔ کھڑکی کی درز سے آنے والی ہوا اب کچھ پرشور ہو گئی تھی اور کبھی کبھی سیٹی کی آواز بنا کر سارے ماحول کو مزید پراسرار بنا رہی تھی۔ کھڑکی کے پار آسمان پر چمکنے والی بجلی وقفے وقفے سے کمرے کو منور کرتی تو سارا منظر روشن ہو جاتا۔

میں ایک چڑیا کی کہانی ہوں --- اندھیرے کمرے میں ایک کاغذ پر لکھے حرف باہر برستی بارش سے بے نیاز ہو کر اپنی بپتا سنانے کی کوشش

کرتے ہوئے بولے --- ایک ایسی چڑیا جس نے ایک انسان کو قتل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا --- اندھیرے کمرے میں کسی نے اسے ٹوکا نہ کچھ کہنے کی کوشش کی --- کاغذ پر لکھی کہانی نے دھیرے دھیرے اپنی بات جاری رکھی --- ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ چڑیا قاتل سے خوفزدہ ہوتی لیکن ایسا ہو نہیں سکا -- کہانی میں قاتل چڑیا کی چوں چوں سے ڈرنے لگا --- اسے محسوس ہوتا کہ چڑیا اس کے گناہ کی گواہ ہے اور اس کی چوں چوں اس کا راز کھول دے گی --- وہ پہلے پہل پرندوں سے چھپتا اور پھر ہر چڑیا کو مارنے کی کوشش کرنے لگا --- لوگ اسے دیوانہ سمجھتے ایک ایسا پاگل جو ہر چڑیا کو مار کے راحت محسوس کرتا تھا --- کہانی کا نام چڑیا کا انتقام ہے

---- ادھوری کہانی اپنی بات بتاتے ہوئے بولی لیکن تیز بارش کے شور سے سہمی کہانیوں نے اس کی کسی بات پر اپنی رائے نہ دی اور خاموشی سے بارش تھمنے اور رات گزرنے کا انتظار کرنے لگیں۔ طوفانی رات کا اختتام ایک خاموش صبح نے کیا ۔ کچھ کہانیاں کھڑکی سے آنے والے بارش کی وجہ سے اپنے مٹتے حروف پر نوحہ کناں تھیں اور کچھ اپنے نصیب اور انجام کے لیے فکر مند -- مکمل خاموشی سارے منظر پر حاوی تھی ------

گزرتے دن کا بہت سا حصہ گزشتہ کئی دنوں کی طرح اسی خاموشی میں کٹ گیا۔ کھڑکی کے پار سے دھوپ کی ہلکی سی کرن بارش کے ختم ہونے اور سورج نکلنے کی خبر دے رہی تھی۔ میز پر پڑے کاغذ کسی حد تک مزید بے ترتیب اور خراب ہو گئے تھے اور کھڑکی کی درز سے آنے والی ہوا سے لرزتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے ۔

کئی دنوں کا سکوت کمرے کے دروازے کے کھلنے کی چرچراہٹ کی آواز سے ٹوٹا۔ درمیانی عمر کی ایک قدرے فربہ خاتون کمرے کی ابتر حالت پر با آواز بلند ماتم کرتی ہوئی اپنے پیچھے کام والی کو ہدایات دیتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں اور ہر چیز پر مٹی دیکھ کر چلانے لگیں۔

میرے علاوہ یہاں کسی کو ہوش ہی نہیں ہے یہاں ----- فرش سے کمبل اٹھاتے ہوئے وہ کمرے میں آتی ہوئی کام والی سے مخاطب ہوئیں --- دیکھ کیا حال ہو گیا ہے کمرے کا

کام والی ان کی عادت سے واقف تھی اور شائد اسی وجہ سے وہ ان کے چیخنے چلانے سے بے نیاز ہو کر صفائی کرتی رہی۔ بڑی بی کچھ دیر کمرے میں اڑتی دھول کو دیکھتے رہنے کے بعد کھڑکی کے پاس پڑے میز کی جانب بڑھیں جہاں گرد سے اٹی ہوئی ادھ لکھی کہانیاں دھری تھیں ۔ بڑی بی نے کاغذات سے دھول اڑانے کی ناکام کوشش کے بعد تمام صفحے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر ڈسٹ بن میں پھینکے اور ہاتھ دھونے کے لیے واش روم کی جانب بڑھ گئیں --

☆☆☆☆☆

گالی

مسلسل ہونٹ کاٹتی۔ آنسو بھری آنکھوں سے چھنگا سی چارپائی پر بے ہوش پڑے انور کو دیکھ رہی تھی۔ دو بیٹیاں، جو جوانی کی سرحد کو عبور کرنے کو تیار تھیں۔ بڑی شمع اور چھوٹی کنول بالترتیب چودہ اور بارہ برس کی تھیں۔ شمیم کی شادی بھی سترھویں سال میں ہوگئی تھی۔ غریب کی بیٹی کی جوانی کو دنیا والے مول تول کے حوالے کر دیتے ہیں سو اس کے باپ نے اپنی تین بیٹیوں کو جلد از جلد بیاہ دیا تھا۔ بیٹا سب سے چھوٹا تھا اس سے کیا آسرا رکھنا تھا، سو اپنے فرض سے آزاد ہوتے ہی زندگی ہار گیا۔ باقی دو بہنوں کی نسبت بقول شمیم قسمت پھوٹ گئی تھی۔

انور شادی کے بعد محنت مزدوری کرتا رہا۔ مگر نشے کی لت نے اس سے یہ سب چھڑوا دیا۔ شمیم کے حواس گم ہونے لگے۔ دو وقت جو روٹی ملتی تھی۔ اس کے بھی لالے پڑنے لگے پہلے انور صرف سگریٹ کے سوٹے لگا کر غموں کو دھوئیں اڑاتا تھا۔ پھر چرس، اور اب پُڑی والا مدہوش کر دینے والا نشہ اس کی رگوں کو سکون دینے لگا۔ وہ گھر آکر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر آنکھیں بند کر کے آڑا، ترچھا سو جاتا تو شمیم کی آنکھیں نہ صرف کھل جاتیں بلکہ پھٹ جاتیں۔ سارا دن وہ اپنے آپ اور اپنوں سے بے خبر اوندھا پڑا رہتا۔ ہوش میں آتا تو گالم گلوچ، مار کٹائی اور چھینا جھپٹی اس کا وطیرہ بن گئے تھے۔ شمیم کا میکہ ماں، باپ کے مرنے کے بعد تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ بھائی چھوٹا تھا۔ بڑی بہن نے اُسے پاس رکھا ہوا تھا۔ رحیم وہاں پڑھ بھی رہا تھا اور ساتھ ہی خراد کا کام بھی شام کو جا کر سیکھتا بہنوئی کی دکان پر، شمیم کس کے آسرے پہ رہتی۔

رفتہ، رفتہ گھر کا سامان بکنے لگا۔ پہلے سیکنڈ ہینڈ ٹی وی پھر چھوٹے سے فریج کی باری آئی جو دو چار الیکٹرونک کی چیزیں تھیں، وہ بھی انور کی نظروں سے بچ نہ سکیں۔

شمیم سسکتے ہوئے جو تھوڑا بہت سلائی کا کام جانتی تھی، مشین سنبھال لی۔ شمع اور کنول کو بھی ساتھ لگا دیا۔ کچھ نہ کچھ دھکے، زور سے گھر کی گاڑی چل نکلی۔ شمع سیدھی سلائی لگاتی۔ کنول سوئی دھاگے کا، کام کر دیتی۔ تینوں کسی حد تک مصروف ہوگئیں۔ انور کے وہی چال چلن تھے بڑا فساد اس روز کھڑا ہوا۔ جب انور سلائی مشین اٹھا کر

فصیحہ آصف خان

جانے لگا شمع اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی۔
ابا، مشین مت لے جاؤ، خدا کے لیے یہ نہ لے جاؤ، شمع سسکنے لگی۔ تب گڑگڑائی، روتی، بلکتی شمع کو ایک نظر انور نے دیکھا اور مشین زمین پر پٹخ کر باہر نکل گیا۔
شمع سلائی مشین کو اپنی جگہ پر رکھ کر کمرے میں آ کر زار و قطار رونے لگی۔ آنسو ہی تو تھے، جنھیں وہ وقت بے وقت بہا سکتی تھی۔
باہر شمیم اور کنول الگ اشکبار تھیں۔ کپڑے سلائی کر کے ہی تو وہ پیٹ بھر رہی تھیں۔
جیسے ہی سلائی کی رقم ملتی شمیم واپسی پر آٹا اور دال لے آتی کبھی عیاشی ہوتی تو سبزی کے مزے بھی اڑا لیے جاتے۔ یہ تب ہی ممکن تھا جب پیسے انور کی دسترس سے دور رہتے۔
شمع نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، باپ نے نہ صرف گالیاں اور فاقے ہی دیئے تھے، بلکہ ہر خواب بھی چھین لیا تھا۔ رہی سہی کسر انور کے نشے اور کاہلی نے ختم کر دی تھی۔ شمیم بمشکل تمام دو وقت کی روٹی اور بیٹیوں کو سنبھالنے کی تگ و دو میں رہتی۔ زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہی تھی۔

کیسے، کب حالات درست ہوں گے۔ سال کے سال گزر رہے تھے، وہ بھی گزرے سالوں کی طرح سال خوردہ ہوتی جا رہی تھی۔
کنول بھی شازیہ کے برابر آئی اور شمیم نے دھک سے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا۔ دونوں کو دیکھ، دیکھ کر ہولتی رہتی۔
ایک دم دروازہ دھاڑ سے کھلا۔
پیسے دے حرامزادی۔ عیش کر رہی ہے۔ انور حسب معمول اندر آیا وہ گھر چھوڑ کر آئی بریانی کھا رہی تھیں کہ انور بڑے دروازے کو لات سے دھکا دے کر اندر آیا۔ انھیں کھاتا دیکھ کر گالیوں پر اُتر آیا۔ غصہ عروج پر تھا اور نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ شکر تھا کہ تینوں نے آخری نوالہ حلق سے اُتار لیا تھا، ورنہ انور جس طرح جھپٹنے کے انداز میں آیا تھا۔ چاولوں کا ایک دانہ بھی نہ بچتا۔
اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ جسم پہلے سے زیادہ نحیف و نزار تھا۔ مگر زبان پر انگارے دھرے تھے، کئی دنوں سے اسے نشہ کرنے کو کچھ نہ مل رہا تھا۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔
نہیں ہیں میرے پاس پیسے، کچھ بھی نہیں ہے۔
اس بار شمیم نے کافی طاقت ور انداز اختیار کرتے ہوئے کہا، اور اُسے نفرت سے گھورنے لگی۔
تو، تو یہ اپنے باپ کے جہلم کی بریانی ٹھونس رہی ہے۔ انور لڑکھڑائی آواز اور لرزتی ٹانگوں کا بوجھ سنبھالتے ہوئے بروقت تمام مغلظات بکتے ہوئے بولا۔ تب شمیم کی قوت برداشت ختم ہونے لگی۔
جا۔ جا چلا جا کچھ نہیں ہے میرے پاس۔
وہ اُٹھ کر جھوٹے برتن، کھرے میں رکھتے

ہوئے بولی، اشارے سے اس نے شمع اور کنول کو اندر جانے کو کہا، وہ اندر جانے لگیں تو انور نے شمیم کی چوٹی پکڑی اور جھٹکا دے کر گالیاں بکنے لگا۔

شمیم میں نجانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ اس نے نہ صرف خود کو چھڑایا بلکہ انور کو دھکا دے کر گھر سے باہر نکال کر کنڈی لگا دی۔ اور دروازے پر سر ٹکا کے شدت سے رونے لگی۔ شمع اور کنول بھی ماں کے دائیں، بائیں آ کر اس سے لگ کر رونے لگیں۔

کیسی عجیب زندگی تھی۔ باہر دروازے کے پاس گرا انور مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔ کوسنے، مغلظات جو اس کے منہ میں آ رہا تھا، بکے جا رہا تھا۔ پھر کوئی کچھ دیر خاموشی چھا گئی۔

دروازہ کھولو۔ دروازہ میں ہوں۔ برابر والے حاجی صاحب کی تیز آواز پر دروازہ زور، زور سے پیٹنے لگا۔

شمیم نے حواس باختہ ہوتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے چند مرد، مع حاجی صاحب کے موجود تھے۔ پیچھے مردہ انور میت کی صورت میں چارپائی پر پڑا تھا۔ وہ اسے اندر لے آئے۔ شمیم نے دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

تو گویا یہ تلخ باب بند ہوا گھر محلے کی عورتوں سے بھر گیا۔ شمع اور کنول کے سر پہ ہاتھ رکھے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں رشتے بدل گئے۔ بیوہ اور یتیم کی پکار پڑی۔ یہ ایسی پکار تھی جو کلیجے میں اپنی کی طرح گھٹتی تھی۔ شمیم کی بہنیں اور بھائی بھی آ گئے اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ اب تک اتنے آنسو بہا چکی تھی کہ اب رویا ہی نہ جاتا تھا۔ نہ رونے سے انور واپس آ جانا تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

اُس کے پاس کوئی رقم اور اثاثہ نہ تھا کفن، دفن کا انتظام ہی کر لیتی۔ محلے والوں نے مل جل کر اس موقع پر اس کا ساتھ دیا۔ چاولوں کی دیگ بھی کوئی لے آیا۔ شام تک انور کی تدفین ہو گئی۔

حاجی صاحب۔ ان کی بیوی اور بیٹوں نے اس دکھ کی گھڑی میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ رفتہ رفتہ سب اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔

عجب ماتمی فضا تھی، کافور اور پھولوں کی باس نے قلب و ذہن پر عجب کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ شمیم نے دیگ کے بچے ہوئے چاول ایک پتیلے میں منتقل کر دیے۔ اس کا دل اور آنکھیں ویران تھیں۔ شمع اور کنول بھی سہمی بیٹھیں تھیں۔ تینوں خاموشی سے اپنے اپنے بستروں پر جا سوئیں۔

اگلے دو چار دن تعزیت ہوتی رہی۔ بالآخر سب معمول پر آ گیا۔

تینوں نے پھر سلائی مشین سنبھال لی۔ اور دن رات کا چکر کام دھم کی نذر ہونے لگا۔ مشین جو انھیں جان سے زیادہ عزیز تھی۔

شمیم قریب کی فیکٹری سے چادریں لے آتی- آس، پاس کے گھروں سے بھی کچھ سلائی کے کپڑے آ جاتے- گھر کی گاڑی اور دال، روٹی چلنے لگی- انور کا چالیسواں بھی گزر گیا- اس شام حاجی صاحب اور ان کی بیوی آ گئے-

اپنے بیٹے مجاہد کے لیے شمع کا ہاتھ مانگنے آئے تھے- جس کی محلے میں ہی کریانہ کی دکان تھی- نیک، خاموش طبع، بارلیش، سلجھا ہوا جوان تھا- دیندار گھرانہ تھا- حاجی صاحب کی بیوی بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں- برسوں کا ساتھ تھا- شمیم کو سر سے بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا- اس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا، یوں اگلے دو ماہ بعد ہی شمع مجاہد کی بیوی بن گئی- ساتھ ہی گھر تھا- دن میں کئی بار شمع چکر لگا جاتی- سسرال والوں کو بھی اعتراض نہ تھا- ماں کے گھر آ کر سلائی بھی کر جاتی-

---

باقی سب کچھ ٹھیک تھا، مگر مجاہد کا غصہ، جس سے وہ پناہ مانگتی رہتی تھی- وہ دل کا جس قدر اچھا تھا، زبان کا اس قدر کڑوا تھا-

ہاں...... ہاں...... اس وقت، شمع کی سماعتیں سُن ہو گئیں- نیک نمازی گھرانہ، صوم وصلوٰۃ کا پابند، رکھ رکھاؤ اور وضع دار، بظاہر___ عزت دار___ دیندار- مگر جب کمرے میں اس نے شمع کو سخت بُرا بھلا کہا، شادی کے دو ماہ بعد ہی اس کا غصہ ایسا تھا کہ شمع تھر تھر کانپنے لگی-

بات یہ تھی کہ آج کھانے میں کچھ دیر ہو گئی تھی-

شمع کی طبیعت متلا رہی تھی- اس نے جیسے تیسے کھانا بنا لیا- حاجی صاحب اور ان کی بیوی کسی گاؤں میں تعزیت کرنے گئے ہوئے تھے- بے غیرت، حرامزادی، گالی- گالی- گالیاں- شمع کی سماعتیں بند ہونے لگیں- آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا___ انور- باپ- مجاہد، شوہر- مرد___ گالیاں- شمع پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی- روتی- کیسے روتی- کیسے بند باندھتی ان مغلظات کے آگے؟ شمیم بھی تو کچھ نہ کر پاتی تھی-

وہ عورت تھی- مجبور تھی - گالی سننا اس کی سرشت میں تھا- وہ سنتی تھی- سنتی رہے گی، مرد اور گالی لازم وملزوم ہیں- خواہ وہ کسی بھی طبقے کا ہو- ان پڑھ ہو، نشئی ہو، جاہل ہو- یا نیک- صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو، دیندار ہو- مگر بیوی کو گالی دینا اپنی مردانگی تصور کرتا ہے-

گالی سنتے وقت عورت بے بسی کی آخری حد کو چھو رہی ہوتی ہے- مگر اسے یہ سب زندگی کے آخری لمحے تک خواہ اس کی اپنی زندگی ہو یا شوہر کی زندگی___ اسے گالیوں سے پیٹ بھرنا ہے-

☆☆☆☆☆

کہانی ایک خواب کی

خوابوں کی حقیقت کیا ہے ___ نامعلوم، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کچھ خواب اتنے شفاف ہوتے ہیں حقیقت کا گمان ہوتا ہے کبھی کبھی میں اٹھتا ہوں تو آنکھیں بھیگی ہوتی ہیں بس اتنا یاد رہتا ہے میں بہت رویا ہوں اور میرا تکیہ بھی اس کا گواہ ہوتا ہے ..... میں اس رات اپنے موبائل پر ہی سورۂ کہف کا ترجمہ پڑھ رہا تھا دیر تک سوچتا رہا یہ حضرت ذوالقرنین جن کا ذکر باری تعالیٰ نے قرآن میں سورۂ کہف میں کیا ہے وہ کس زمین پر گھوڑا دوڑاتے رہے کہ پہلے انہیں جہاں سے سورج نکلتا ہے اس جانب اور پھر جہاں سورج ڈوبتا ہے اس مقام تک حکم سفر ملا، ظاہر ہے یہی زمین ہو گی لیکن وہ مقام کون سا تھا اور کہاں ہے جہاں دو پہاڑوں کب بیچ آپ نے ایک قوم کی مدد کرتے ہوئے سیسہ پلائی دیوار اٹھائی، دیر تک نیٹ پر تلاش کے باوجود اس مقام کے اشارے نہیں ملے --- معلوم نہیں کب آنکھ لگی.....

مجھے محسوس ہوا میں گہرے پانی میں تیر رہا تھا لیکن سب صاف دکھائی دے رہا تھا میرے اردگرد ایک ہجوم تھا مچھلی نما لوگ یا مچھلیاں ادھر ادھر کسی انجان منزل کی جانب تیر رہے تھے..... مجھے لگا میں اکیلا ہوں لیکن نہیں کوئی میرے ساتھ تھا ----- غور سے دیکھا تو وہ ایک نہایت ہی حسین مچھلی تھی لیکن وہ تو بہت حسین عورت تھی سبز آنکھوں والی سنہری بالوں والی اتنی حسین کہ حسن بھی اسے دیکھے تو مبہوت ہو جائے وہ میرے ساتھ ساتھ ہی تیر رہی تھی پر میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ

سید تحسین گیلانی

اس کا دھڑ تو انسانی تھا لیکن وہ نیچے سے مچھلی نما تھی...... میرے منہ سے چیخ نکلی تم تم جل پری ہو... تو وہ مسکرانے لگی اور اس نے میری ٹانگوں کی جانب اشارہ کیا میں نے غور سے نیچے دیکھا تو میں بھی دھڑ سے نیچے اس جیسا ہی تھا...... مچھلی نما...... میرے ہاتھ ... میں چلایا.. میرے پیر...... میں رونے لگا...... بچاؤ...... تم کون ہو...... وہ میرے پاس آئی اور پہلی بار بولی میرے ساتھ چلو ڈرو مت تمہیں کچھ نہیں ہوگا خاموش رہو اور غور سے دیکھو ہم مگرمچھوں کی بستی سے گزر رہے ہیں لیکن یہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے اس وقت یہ سب سو رہے ہیں... میں نے غور سے دیکھا تو ان کی آنکھیں کھلی تھیں...... تم جھوٹ بول رہی ہو یہ تو جاگ رہے ہیں وہ ہنسی...... ارے پگلے اسے کھلی آنکھوں سے سونا کہتے ہیں یہ خیال رکھنا یہ پیٹھ پر دانت گاڑھنے والے مگرمچھ ہیں میں نے مزید غور کیا تو ان میں کئی چہرے مجھے بہت قریبی لگے شاید میرے اپنے...... ہم تیزی سے وہاں سے نکلے...... اس نے کہا آنکھیں بند کرو...... میں نے آنکھیں بند کیں..........

ہاں اب کھولو.......... ارے ارے...... ہم .. ہم اڑ رہے تھے اور کس قدر بلندی پر اور میرے پر اس قدر بڑے تھے کہ میں حیران پریشان اس کو تک رہا تھا جو میرے ساتھ ہی قوس قزح کے جیسے پروں کے ساتھ اڑ رہی تھی شاید میں نے سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا ہم لمحوں میں فضا کو چیرتے آگے بڑھ رہے تھے کیا حسین منظر تھا دور دور تک سبزہ ہی سبزہ تھا انسانوں کا نام و نشان نہیں تھا آبشاریں یوں لگ رہی تھیں جیسے پہاڑوں سے دودھ بہہ رہا ہو کچھ دیو قامت جانور گھومتے نظر آئے، پھر ہم ایک بندروں کی بستی سے گزرے اس نے کہا یہاں ٹھہرو اور نہیں غور سے دیکھو یہ انسان تھے میں نے انہیں گفتگو کرتے سنا تو وہ عجیب سی بولی بول رہے تھے لیکن ان کا رہن سہن انسانوں تھا ہی تھا لیکن مجھے ان کے برتاؤ اور آپسی نفاق سے ان کی اس حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا--- ہم ایک بار پھر محو پرواز تھے وہ میرے ساتھ ہی تھی اب ہم انسانی حالت میں تھے لیکن پروں کے ساتھ بے لباس ایک دوسرے کو تکتے جاتے لیکن شہوت کے آثار کہیں نمایاں نہیں تھے وہ بولی دیکھو بولنا نہیں بس دیکھنا یہ بستی یہ لوگ غور سے دیکھ لو مجھے تمہیں یہاں تک لانا تھا میں سنتا رہا جیسے میرے لب سلے ہوں ہزاروں سوالات کے باوجود میں کچھ کہہ نہ پایا... سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا ایک نہ ختم ہونے والا

دلکش سلسلہ میرے سامنے تھا ہوا میں ٹھہرے ہوئے دیکھتے اس جنت نظیر وادی میں دور چند انسانوں کو رینگتا دیکھ رہے تھے لیکن یہ تو کوئی پست قد مخلوق تھی مجھے وہ زمین پر رینگتے ہوئے کیڑے معلوم ہوئے کہ یکا یک میں نے دو قوی ہیکل انسانوں کو ان کے بیچ دیکھا جو ان پر ظلم ڈھا رہے تھے تشدد بھرے یہ مناظر دلخراش تھے جب وہ چلے گئے تو اس رینگتی ہوئی مخلوق میں سے ایک چبوترے پر آ کھڑا ہوا اور سب اس کے ارد گرد جمع ہو گئے انہوں نے اس شخص کا خطاب سنا اور سب زمین پر سجدہ ریز ہو گئے ...... میں یہ سب دیکھ رہا تھا.. شاید وہ اپنے خدا سے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے کہ ان ظالموں کے ظلم وستم سے انہیں چھٹکارا نصیب ہو ان کے رونے اور دھاڑیں مارنے کی صدائیں فضا میں بلند ہو رہی تھیں یہ سلسلہ جانے کتنے دن جاری رہا نہیں معلوم لیکن میں وہاں موجود تھا اور سب دیکھ رہا تھا... پھر میں نے گھوڑے پر سوار ایک خوب رو شہزادے کو آتے دیکھا اس نے ان رینگتے انسانوں کو مخاطب کیا تمام لوگ ایک بار پھر اس چبوترے پر اکٹھے ہوئے اور سب کے چہرے خوشی سے جھوم اٹھے شاید وہ ان کا مسیحا تھا ...... پھر وہ قوم ایک ہو کر اس کا ہاتھ بٹانے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس شہزادے کی مہارت کی مدد سے ان دو پہاڑوں کے بیچ و بیچ لوہے کی ایک دیوار چن دی بنیادوں میں لوہا پگھلایا گیا اور یوں وہ رینگتی ہوئی مخلوق ان دیو ہیکل ظالموں سے محفوظ ہوئی اپنا کام ختم کرتے ہی شہزادے نے ان سے اجازت چاہی اور گھوڑے پر سوار نامعلوم سمت میں روانہ ہوا ...وہ مخلوق ایک بار پھر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوئی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر مسکرائے...... وہ بولی اب تم جاؤ مجھے شدت سے یاد کرنا میں پھر حاضر ہو جاؤں گی ......اس بار میں اس سے مخاطب ہوا لیکن تم اپنا نام تو بتاتی جاؤ میں تمہیں کیسے پکاروں گا ...وہ مسکراتے ہوئے بولی میں تمہارے ساتھ ہی رہتی ہوں ... میں خواہش ہوں خواہش!!

میری آنکھ کھلی تو میں پسینے سے شرابور تھا ایک بار پھر اس مقام کی تلاش میں جت گیا جہاں سے ابھی ابھی میں لوٹا تھا...

وہ دنیا سے اوجھل مقام کہیں تو ہے... لیکن یہ آج بھی ایک سوال ہے!!! کہاں؟

☆☆☆☆☆

زیر سیریز ''وباء کے دنوں میں'' **قرنطینہ**

شادی کو چالیس برس ہونے کو آئے تھے، لیکن جوڑا ایک چھت کے نیچے صرف رہ رہا تھا، برت نہیں رہا تھا ----- جس طرح گھاس پھونس کے اندر بھی چڑیا، فاختہ انڈے سیہ لیتی ہیں اور ماں بن جاتی ہیں، یہ جوڑا بھی کسی جبلی لمحے میں والدین بن گیا تھا--- کسی مضطرب سی خواب گاہ کے اندر--- افتادِ طبع نے جانے کیسے ان لمحوں میں ایک دوسرے کو قبول کر لیا تھا وگرنہ پہاڑ کی چوٹی سے چلائی غلیل کا نشانہ زمین پر کبھی کامیاب نہیں ہوتا--- ان دو مزاجوں میں ایک دوسرے کے لیے زمین اور آسمان کا فاصلہ تھا۔

بیگم صاحبہ ایک گرلز کالج کی پرنسپل اور صاحب وزارت محنت میں ایک سینئر پوسٹ سے سبکدوش ہوئے تھے۔ دونوں کی ازدواجی زندگی یوم آزادی کی تاریخ سے شروع ہوئی تھی اور ہمیشہ کی قید میں تبدیل ہو گئی تھی---- ایک پنجرے میں گویا دو پنچھی ایک ساتھ رہنے پر مجبور و مجہور تھے ----- ہمہ وقت قریب قریب رہنے کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ دور کی نظر کمزور ہو جاتی ہے اور قریب کی نظر دھندلانے لگتی ہے، اس دھندلاہٹ میں چہرے کے خدوخال مدھم اور کارکردگی معدوم ہو جاتی ہے اور شخصیت میں سوا دراڑوں اور گڑھوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا--- ایسا ہی اس جوڑے کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ ان میں سے ہر کوئی خود کو مخمل اور دوسرے کو پیوند کہتا اور تہواروں پر بھی ایک دوسرے کو نظر اٹھا کر دیکھنا خلاف قانون سمجھتا تھا----- دونوں نے ہمیشہ اپنی کمائی ایک دوسرے سے چھپائی اور مل کر بھی ذاتی گھر نہیں بنا سکے۔ تھے--- یہ دو کمروں پر مشتمل ایک سر چھپائی ان کے دونوں لڑکوں نے بڑے ہو کر اپنی کمائی سے خریدی تھی اور ماں باپ کو بڑی عزت کے ساتھ رکھے ہوئے تھے---- دونوں کی بیویاں بھی معزز اور مؤدب تھیں۔

اسی دوران آسمان سے ایک انوکھی وباء

فرخندہ شمیم

زمین پر اتری اور، زمین والوں کی ہوائیاں اڑ گئیں--- بوکھلاہٹ میں انہوں نے اس وبائی جرثومے کو الگ الگ نام دے کر انسان کی انسان کے ساتھ سازش قرار دے دیا---- جب کچھ بھی نہ سوجھا تو اپنے ہاتھ، چہرے اور آنکھیں چھپا لیں-- اور- سماجی فاصلے بڑھا لیے--- طے یہ ہوا کہ اپنی اپنی حفاظت خود کرنی ہے--- گرم پانی پینا ہے-- نزلہ، کھانسی اور تنفس کی اکھڑاہٹ سے ڈرنا ہے---

اس کا واحد موثر علاج خوراک اور نیند کے ذریعے اپنی قوت مدافعت کو بڑھانا ہے---- کم سن بچے اور عمر رسیدہ افراد اس کا زیادہ شکار ہو سکتے ہیں-- یہ بھی بتایا گیا-- وائرس سے متاثرہ افراد کے لیے قرنطینہ کی اصطلاح رائج ہو گئی اور وباء کے شکار افراد کو دوسرے افراد سے علیحدہ کمرۂ تنہائی میں رکھنا لازمی قرار دے دیا گیا تاکہ گھر کے دوسرے افراد اس ہوائی بیماری سے بچے رہیں--- بدقسمتی سے۔ مذکورہ جوڑا بھی وائرس کی زد میں آ گیا تھا--- جس سے پورے گھر میں ایک سراسیمگی پھیل گئی--- مشکل یہ تھی کہ گھر میں صرف ایک کمرہ زائد تھا اور دونوں کو ایک ہی جگہ رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا--- اپنے اپنے میان سے اگر دونوں کی تلواریں نکل پڑیں تو گھر کو جنگ پانی پت سے کون بچائے گا؟

بالآخر جوڑے کو وباء کی سنگینی سے ڈرانے کے لیے بڑے بیٹے نے کامیاب کوشش کی اور جوڑا ایک کمرے میں رہنے پر آمادہ ہو گیا----- زندہ رہنے کی خواہش کے سامنے ہر شرط قابل قبول ہو جاتی ہے---- جوڑا ایک قرنطینہ کمرے میں منتقل ہو چکا تھا--- ایک دوسرے سے بے زار، اپنی اپنی کرسی پر ایک دوسرے سے پیٹھ پھیر کر لیکن سانس ایک ہی جگہ لینے پر مجبور---- بہوؤں نے ضرورت کی ہر چیز کمرے میں رکھ دی تھی--- پھل، ادویات، دودھ دہی کے کارٹن، نیم گرم پانی کے تازہ تھرموس--- کے علاوہ وقت مقررہ پر کمرے کے اندر غذا کی باقاعدہ فراہمی---- بزرگ جوڑے کی خدمت میں کوئی کمی نہیں تھی----- باہر والوں کو دھڑکا بس یہ تھا کہ کہیں اندر سے برتن ٹوٹنے کی آوازیں نہ آنا شروع ہو جائیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا---- اور دن گزرنے لگے---

قرنطینہ کے اس عرصے میں بیگم صاحبہ پہلی بار اس وقت چونکیں جب ان کے چھینکنے پر صاحب نے جلدی سے انہیں ٹشو کا ڈبہ پیش کر دیا، تاہم منہ دوسری جانب کر کے--- وہ چڑ گئیں- میرے جراثیم سے نفرت---- جیسے انہیں تو کرونا ہے ہی نہیں--" --- واہ جی واہ--- صاحب ٹشو کا ڈبہ انہیں دے کر دور پڑے صوفے پر بیٹھ

گئے ---- اتنے میں انہیں کھانسی نے آ لیا --- بیگم صاحبہ ترنت اٹھیں اور تھرموس میں سے نیم گرم پانی کا گلاس لا کر انہیں تھما دیا - - - منہ دوسری جانب کر کے ---- صاحب نے پانی پی لیا --- یہ تعین بہت مشکل ہو رہا تھا کہ ہمدردی ہے، پرہیز ہے یا احسان واپس کیا جا رہا ہے --- حتیٰ کہ رات ہو گئی۔

صبح دم ناشتہ کر کے صاحب اخبار پڑھنے میں لگ گئے اور بیگم صاحبہ شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر کنگھی کرنے لگیں --- صاحب کی نگاہ بے خیالی میں ان پر پڑ گئی تو خوشگوار سی ایک لہر نے انہیں چھو لیا۔

"اتنی بری دکھتی بھی نہیں، میں ہمیشہ انہیں کیوں ناپسند کرتا رہا؟

لیکن وہ زیادہ نہ سوچ سکے --- بیگم صاحبہ چٹیا گوندھ کر فارغ ہو چکی تھیں اور اب مڑنے ہی والی تھیں، کہیں کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہو جائیں

صاحب پھر سے اخبار میں دھنس گئے ---

جوڑا وائرس سے بچاؤ کے طبی احکامات میں پوری طرح سنجیدہ تھا --- کوئی لاپرواہی نہیں کر رہا تھا -- تنفس میں بگاڑ بھی صرف اس وقت آتا تھا جب دونوں ایک دوسرے کے لیے بڑبڑاتے یا ماتھے کی شکن ناہموار کر لیتے -- ورنہ چہرے پر عمر کی جھریوں کے علاوہ کوئی رنگ زنگ نہیں تھا ---- قرنطینہ کے فوائد سامنے آنے لگے تھے ----

اس شام موسم کی خنکی کا احساس ماحول کو افزا کر رہا تھا اور قرنطینہ کا گوشہ بھی اس حسن سے گنگنانے لگا تھا --- صاحب واش روم سے نہا دھو کر باہر نکلے تو معمری کی وجاہت نو عمری میں ڈھلتی نظر آئی --- بیگم صاحب چونکے بغیر نہ رہ سکیں ---

ارے --- یہ تو خوبصورت ہیں ---- مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہوا --- ممکن ہے کبھی دل جمی سے دیکھا ہی نہ ہو انہیں - - - مگر انہوں نے بھی تو کبھی احساس نہیں دلایا --- سدا لڑنے سے کام رکھا -- وہ زیرلب بڑبڑائیں --- صاحب نے شاید سن لیا تھا مگر کچھ بولے نہیں --- آج دونوں ایک دوسرے کو چھپ چھپ کر دیکھ رہے تھے -- بلی چوہے کا کھیل رچاتے ہوئے -- رومان کی اولین ملاقات میں جیسے ایک دوسرے سے بچتے بچاتے محبتی - - - کبھی درخت اور کبھی پھولوں کے جھنڈ میں چھپتے چھپاتے --- ہاتھ نہ آنے کا دعویٰ کرتے --- بیگم اور صاحب پہلی بار محبت کی اولین سیڑھی پر پاؤں دھر رہے تھے شاید --- پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو قبول کرنے کا خیال آیا تھا - وباء کے مریض جان گئے تھے، قوت مدافعت ایک دوسرے کو تسلیم کرنے سے بڑھتی ہے --- دونوں کی زندگی سے جرثومہ نکلنے لگا --- یہ دیکھ کر قرنطینہ کو بہت خوشی ہو رہی تھی -- !

☆☆☆☆☆

بس اسٹینڈ کی کہانی

میں ایک بس اسٹینڈ ہوں--- میری دائیں طرف ریلوے اسٹیشن اور بائیں طرف شہر کی ہائی سٹریٹ ہے--- جس کے کونے پر میکڈونلڈز ہے--- دن بھر مختلف شہروں کی بسیں یہاں آ کر رکتی ہیں--- مختلف نسلوں، عمروں اور زبانوں والے لوگ بسوں سے اترتے اور چڑھتے ہیں--- سکولوں کے بچے، ادھیڑ عمر مرد اور خواتین کی تعداد زیادہ ھے کیونکہ یہاں نوجوان عام طور پر اپنی کاروں میں سفر کرتے ہیں---

ریلوے اسٹیشن پر جب کوئی گاڑی رکتی ہے تو سڑک کے دونوں طرف لوگوں کا رش ہوجاتا ہے --- جانے والے اور آنے والے--- سب ٹریفک کا اشارہ کھلنے تک رکتے ہیں اور پھر اپنی اپنی منزل کی طرف چل دیتے ھیں --- بس سٹینڈز اور ریلوے اسٹیشن کے مسافر روزانہ ایک جیسے نہیں ہوتے--- ہر روز نئی سواریاں اور نئے مسافر آتے جاتے رہتے ہیں--- لیکن کچھ مسافر ایسے ہیں جو برسوں سے روزانہ یہاں آ رہے ہیں--- ان کو دیکھنے کی مجھے اتنی عادت ہوچکی ہے کہ کسی دن یہ نا آئیں تو میں خود ان کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔

ایک ستر سالہ انگریز جس کا نام رچرڈ ہے اور یہاں کا پیدائشی شہری ہے --- بس نمبر 420 سے روزانہ اترتا ہے--- اس کے دونوں ہاتھوں میں چار تھیلے ہوتے ہیں--- لگتا ہے کہ تھیلے کافی وزنی ہیں ان کو اٹھا اٹھا کر اس کے کندھے ایک جانب جھکے ہوئے ہیں--- یہ ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہنتا ہے--- اور بس سے اتر کر میکڈونلڈز کے اندر چلا جاتا ہے--- پھر آرام سے بیٹھ کر چائے پیتا ہے--- میکڈونلڈز سے نکل

نیلما ناہید درانی

کر قریبی مال کا چکر لگاتا ہے---اس کے تھیلے اس کے ہاتھوں میں ہی ہوتے ہیں--جیسے وہ اپنا خزانہ یا سارا اثاثہ ساتھ لیے پھرتا ہے---اسے شاید اوسی ڈی ہے جو ایک قسم کی ذہنی بیماری ہے۔

ایک اور شخص یہاں بس سے اترتا ہے--عمر پچپن، ساٹھ کے قریب---اس کے بال الجھے ہوئے رنگت گہری کپڑے بوسیدہ اور حلیہ بھکاریوں جیسا ہے--لیکن یہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا-- کسی نا کسی بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پیتا رہتا ہے--اس کی قومیت کی پہچان نہیں ہو سکی ---اس کی ایک گندی عادت یہ بھی ہے کہ بس سے اترنے کے بعد سڑک کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر پیشاب کرتا ہے---خواہ وہاں کتنے ہی لوگ موجود ہوں---

ایک تیسرا شخص ہے--اس کی عمر اسی سال کے لگ بھگ ہے ہاتھ میں چھڑی فیلٹ ہیٹ پہنے--مارکیٹ سے چلتا ہوا آ کر یہاں بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پیتا ہے----اس کے دائیں ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے اور بائیں ہاتھ سے اس نے اپنی پتلون سنبھالی ہوتی ہے---اس لیے وہ دور سے آتا ہوا دکھائی دے جاتا ہے--یہ پیدائشی انگریز ہے اور اسی بستی کا رہنے والا ہے--خواہ کیسا موسم ہو سردی، گرمی، بارش، برفباری---یہ دن میں کئی بار آ کر بنچ پر بیٹھتا ہے--مخصوص انداز میں سگریٹ سلگاتا ہے---اور سگریٹ ختم کرنے کے بعد میکڈونلڈز کے باہر ستون کے ساتھ بلا خوف و خطر پیشاب کرتا ہے---اور اسی طرح ایک ہاتھ سے پتلون سنبھالتا دوسرے سے چھڑی ٹیکتا اپنے گھر چلا جاتا ہے---یہ دن میں کئی بار آتا ہے---اس کی پیشاب کرنے کی عادت شاید انتقاماً ہے کیونکہ جس ستون کے ساتھ وہ پیشاب کرتا ہے اس کے پیچھے باتھ رومز ہیں--جو صرف بس اسٹینڈ کے عملے اور بس ڈرائیوروں کے لیے ہیں---اس لیے ہمیشہ مقفل رہتے ہیں--ڈرائیور استعمال کے بعد ان کو مقفل کر کے چابی دفتر والوں کو دے دیتے ہیں--

میکڈونلڈز میں بھی واش رومز ہیں مگر وہ صرف اپنے گاہکوں کو استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں---

جانز ان دونوں کو دکھا کر دن میں کئی بار اپنا حق آزادی استعمال کرتا ہے--

لاک ڈاون لگا--تو بسوں کی تعداد کم ہو گئی--دکانیں بازار بند ہو گئے--میکڈونلڈز بھی بند ہو گیا---سڑکیں سنسان رہنے لگیں---مجھے ہر وقت رونق میں رہنے کی عادت تھی---بس بھی اکا دکا آتی---کوئی

کوئی مسافر منہ پر ماسک لگائے اترتا اور یوں ڈرتا ہوا چلتا جیسے کوئی بلا پیچھے لگی ہے---

اب نا سکولوں کے بچوں کی شرارتیں تھیں--- نا میکڈونلڈز کے باہر گاہکوں کی قطاریں--- یہاں تک کے ہر وقت ارد گرد منڈلانے والے کبوتر بھی چھتوں پر دبکے بیٹھے رہتے---

میں بہت اداس تھا اور پریشان بھی--- کرونا جیسی وبا سے لوگ دھڑا دھڑ مر رہے تھے --- مجھے لگتا تھا دنیا ختم ہو جائے گی--- خاص طور پر عمر رسیدہ لوگ سب چل بسیں گے--- اس وبا کو برداشت کرنا ان کے بس میں نہیں ہوگا--- خبریں بھی ایسی آ رہی تھیں کہ ہسپتالوں میں وینٹیلیٹرز کم پڑ گئے ہیں---

ساری دنیا لاک ڈاون میں چلی گئی ہے--- شاید دنیا آدھی رہ جائے گی--- مجھے ویران سڑکوں اور بند دکانوں سے خوف آنے لگا تھا--- لگتا تھا دنیا اب کبھی نارمل نہیں ہوگی--- زندگی رک گئی تھی--- ایک سال ایسے ہی گزر گیا--- دوسرا سال بھی آدھا یونہی گزرا ---- قید تنہائی کیا ہوتی ہے--- مجھے اس کا پوری طرح ادراک ہو چکا تھا--- اچانک اعلان ہوا کہ کرونا کی پابندیاں نرم کر دی جائیں گی --- سکول کھولے گئے--- بچوں کی آمد و رفت جاری ہوئی--- بسیں چلنے لگیں--- ریسٹورنٹس کھل گئے--- زندگی پھر رواں دواں ہو گئی---

420 نمبر کی بس سے تھیلے اٹھائے رچرڈ نکلا اور میکڈونلڈز میں داخل ہو گیا--- وہ حسب معمول صاف ستھرے لباس میں ملبوس تھا--- تھیلوں کے وزن کی وجہ سے کندھے جھکے ہوئے تھے--- چہرے پر تھکن کے آثار نہیں تھے

لمبے غلیظ بالوں اور بوسیدہ کپڑوں والے شخص نے بس سے اترتے ہی کونے میں جا کر پیشاب کیا--- اس کا وہی پرانا لباس تھا پھٹا ہوا کالا کوٹ چہرہ بالوں کی لٹوں سے ڈھکا ہوا--- اس نے بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا اور خود کلامی میں مصروف ہو گیا

جونز فیلڈ ہیٹ پہنے ایک ہاتھ میں چھتری اور دوسرے ہاتھ سے پینٹ سنبھالتا ہوا آیا اور بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا--- کچھ دیر بعد سگریٹ پھینک کر میکڈونلڈز کے قریب ستون کے پاس گیا--- فاتحانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پتلون کی زپ کھول کر پیشاب کرنا شروع کر دیا---

زندگی پھر سے نارمل ہو چکی تھی--- بس اسٹینڈ پر آنے والے سب لوگ کرونا لاک ڈاون کے بعد بھی زندہ تھے---

☆☆☆☆☆

ہینڈ پمپ

اس کی نیلی آنکھوں میں سرخ ڈورے کچھ ایسے پھیلے ہوئے تھے جیسے گگن پر شفق نے کرنوں کو ترتیب سے سجالیا ہو۔ سپید اجلی رنگت اور اس پر نیلی آنکھوں کی شفق آمیزی نے اس کا حسن کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ دیکھنے والے ششدر و حیران کیوں نہ ہوتے کہ قدرت نے اسے بڑی فیاضی سے سرتا پا حسن کا شاہکار بنایا تھا۔ گداز جسم پہ متناسب خطوط کا جوبن عروج پر تھا۔ گاؤں کی بے کیف اور مغموم فضا میں اس کے ملیح حسن سے رنگ اور کھنکتی آواز سے بسا اوقات ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔

گاؤں کے بانکے اس کی دید کو ترستے رہتے تھے مگر اس کا جلوہ شاذ ہی میسر آتا تھا۔ نعیم، جو اس مختصر سی آبادی ہی کا ایک فرد تھا اور ایک جوانِ رعنا تھا، بھی اس حسن کے شیدائیوں میں اگر سب سے بڑھ کر نہیں تو ان میں سے اکثر کا ہم پلہ ضرور تھا۔ آج بھی وہ آنکھوں میں دید کی تمنا لیے گلی کے اس نکڑ پر دیوار سے ٹیک لگائے بڑی دیر سے منتظر تھا جہاں سے اس نورستہ کلی کو ایک نظر دیکھ لینے کی امید بھر آسکتی تھی۔ دھوپ کی شدت میں لحہ بہ لحہ تیزی آ رہی تھی اور پسینہ تھا کہ مساموں سے نکل کر بدن کو آب زار بنانے پر تلا ہوا تھا۔

گلی سے چند قدم دور ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا جو اس چھوٹی سی آبادی کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ یہاں کے مکین اپنی اپنی ضرورت کا پانی یہیں سے گھروں میں لے جایا کرتے تھے۔ کچے مکانات پر دور سے بھی عسرت برستی دیکھی جا سکتی تھی۔ یہاں زمین ریتلی اور بنجر تھی اور کاشت کاری نہ ہونے کے برابر تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ کارپردازِ اقتدار و اختیار اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے لہٰذا کسی قسم کا ترقیاتی کام یہاں تا حال انجام نہیں پایا تھا۔

نعیم نے ہونٹوں پر آیا پسینہ اپنی داہنی آستین سے پونچھا اور خشک پڑتے حلق کا آزار گھٹانے کے لیے ہونٹوں پر زبان پھیری تو نمکین ذائقے نے اس کی پیاس کو مزید بڑھاوا دیا۔ اُدھر دل میں وسوسوں پر وسوسے اٹھ رہے تھے۔ امید و بیم کی متضاد کیفیات کا شکار بیچارا نعیم کبھی اپنی اس حرکت پر پشیمانی محسوس کرتا تو کبھی اک تڑپاتی طلب اسے ڈٹے رہنے پر اکساتی رہتی۔ خواب تھا کہ

عزیز عادل

تعبیر کا متلاشی، امید تھی کہ یاور ہونے کی منتظر۔ اسے معلوم تھا کہ عاشی کے گھر میں آج سوائے اُس اور اُس کی بوڑھی ماں کے کوئی نہیں ہوگا۔ کیونکہ صبح اس کے دونوں بھائیوں کو کام پر جاتے ہوئے خود دیکھ چکا تھا تبھی تو وہ ہمت کر کے یہاں تک آ گیا تھا۔ انتظار جیسا بھی ہو اور جس کا بھی ہو جانکاہ ہوتا ہے۔ نعیم گومگو کی حالت میں کبھی دیوار سے ٹیک لگاتا اور کبھی چند قدم آگے جا کر پھر واپس اپنی جگہ آ جاتا۔

ایک ہلکی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ شاید یہ اس کے اندر کا وہ شور تھا جو ایک عرصے سے اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا، اس نے سوچا اور سر جھٹک دیا۔ مگر نہیں، یہ واہمہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ آواز دوبارہ آئی ایسے کہ جیسے کسی نے کان میں سرگوشی کی ہو۔ اس نے گلی میں نظر دوڑائی مگر یہ کیا۔ وہ تو خالی پڑی ہوئی تھی، نہ آدم نہ آدم زاد کی باس۔ مایوسی اس کے دل پر چھانے ہی والی تھی کہ اس بار اُس کی نگاہ اُس الہڑ اور شوخ و شنگ پر پڑی اور کائنات کی گردش جیسے تھم سی گئی۔ فقط بے ربط سانسوں کی سرسراہٹ اور دل کے دھک دھک کی تھرتھراہٹ گردش کا جواز تھے۔

عاشی دروازے سے نکل رہی تھی۔ اس نے زرد رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا جس پر کالے رنگ کے پتے سے بنے ہوئے تھے۔ اس نے پلٹ کر دروازے کے پٹ برابر کیے۔ تانبے کا گھڑا پہلو میں لیے وہ خراماں خراماں ہینڈ پمپ کی طرف ہولی۔ دھوپ کی تمازت سے اس کے گالوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے گھڑا نل کے نیچے رکھا اور اپنے ماحول سے بے پروا ہو کر پمپ کا دستہ چلانے لگی۔

نعیم تھوڑے فاصلے پر کھڑا اسے از خود رفتگی کے عالم میں دیکھے جا رہا تھا۔ دستے کی ہر حرکت کے ساتھ اس کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو رہی تھی۔ ڈر، خوف اسے ہولائے دے رہا تھا، دیکھ لیے جانے کا خوف۔ مگر دل تھا کہ اسے جی بھر کر دیکھنے اور چھونے کو مچل مچل رہا تھا اور دیکھ لیے جانے کا خدشہ اس پر مستزاد۔ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے قدم عاشی کی طرف اٹھنے لگے۔ عاشی ہر چیز سے بے نیاز گھڑا بھرنے میں مشغول تھی۔ نعیم اس کی پشت سے دبے قدموں اس کی جانب بڑھنے لگا۔ ابھی وہ اُس سے دو چار قدم دور ہی تھا کہ بے خیالی میں اس کا پیر ایک خشک پتے پر پڑا اور چرچراہٹ سی پیدا ہوئی۔ عاشی یکا یک اچھل کر پلٹی تو اُس نے دیکھا کہ خالہ زرینہ کا بیٹا نعیم اُس کے تقریباً پاس ہی ہیجان زدہ کھڑا تھا۔ اُس کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔ اوسان خطا کیوں نہ ہوتے کہ ایک تو دوپہر کا وقت تھا اور گرمی کی شدت کی وجہ سے دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ آج تک کبھی بھی کوئی لڑکا اُس کے اس قدر قریب نہیں آیا تھا اور وہ بھی ویرانی کے ایسے عالم میں۔ اس کے تو فرشتے ہی کوچ کر گئے۔ حواس باختگی میں وہ گھڑا

چھوڑ کر گھر کی سمت دوڑ لگانے ہی والی تھی کہ ایک آواز نے اُس کے پیر جکڑ لیے۔ نعیم نے اُس کا نام لے کر اسے پکارا تھا۔ وہ ملے بغیر اپنی جگہ کھڑی رہی۔ حیادار تھی اور حیا کا پاس رکھنا جانتی تھی۔ وہ تو نعیم کی اچانک آمد نے اُسے بدحواس کر دیا تھا ورنہ وہ کسی سے ڈرتی تھوڑی تھی۔

نعیم کی دلی مراد بھر آئی تھی۔ وہ اس موقع کو بھلا کیسے ہاتھ سے جانے دیتا۔ آج ہی تو اُس پر اللہ سائیں نے اپنے دل کی حالت بیان کرنے کا کرم کیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اُس کے اس قدر نزدیک آگیا کہ اُس کا سایہ عاشی کے سائے میں مدغم ہونے لگا۔ عاشی غضبناک شیرنی کی طرح ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھی۔ کچھ بھی ہو وہ اپنے کردار اور عصمت کو داغدار ہونے کی روادار ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ نعیم آخر اپنے دل کا مدعا بدقت زباں تک لا سکا اور اُس سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کر ہی ڈالا۔ عاشی تو گنگ ہی ہو کر رہ گئی۔ کچھ بھی تو نہیں کہہ سکی۔ اقرار نہ انکار۔ سر پر دوپٹہ ڈال کے گھڑا اٹھانے کو جھکی اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ مگر بخت بدلنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

نعیم کو عاشی سے باتیں کرتے ہوئے گاؤں ہی کے ایک دل جلے الماس خان عرف الماسے نے دیکھ لیا جو اس وقت اُن دونوں سے چند ہی گز دور ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ مکاری اور بے حسی اُس کی ارذل ترین صفتیں تھیں اور تاک جھانک کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ گاؤں والے اُس کی لگائی بجھائی کی عادت سے نالاں تھے مگر اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکے تھے۔ وہ سیدھا عاشی کے گھر تک پہنچا کہ یہ سارا ماجرا اُس کے گھر والوں کو سنائے اور اپنی کسی تشنہ خواہش کی سیرابی کا سامان کر سکے۔ اُس نے دروازے پہ دستک دی۔ دروازہ کھلا تو عاشی کا بھائی کریم جو ایک کڑیل جوان تھا اور بلا کا غصیلا، باہر آیا جو کچھ ہی دیر پہلے طبیعت کی خرابی کے سبب آج ذرا جلدی گھر آگیا تھا۔ الماسے اُس کے مزاج کی گرمی سے واقف تھا۔ اُس نے سارا واقعہ تھوڑے سچ اور بہت سارے جھوٹ کے ساتھ خوب مرچ مسالا لگا کر بیان کر ڈالا۔ کریم ایک تو بیمار تھا اور بیماری کی وجہ سے چڑچڑا ہو گیا تھا، اُس پر الماسے کی باتوں نے اُس کے تن بدن میں وہ آگ لگا دی کہ الاماں۔ بجائے کہ الماسے کی باتوں کو رد کرتا یا خود اُسے ہی برا بھلا کہتا، آنکھوں میں غیض و غضب لیے دروازے کو لات مار کے گھر میں داخل ہوا۔

الماسے نے اُس کی آنکھوں میں قہر برستا تو دیکھا مگر اُس کی اپنی آنکھوں میں مایوسی کا در کھل گیا تھا۔ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا، اُس نے مایوسی سے سر ہلایا اور آہستہ چال چلتا ہوا واپس ہو گیا۔ ابھی وہ گلی کے وسط تک پہنچا ہی تھا کہ اچانک ایک فائر ہوا اور ساتھ ہی ایک دردناک نسوانی چیخ فضا میں پھیلتی چلی گئی۔ آسمان پر اڑتے ہوئے کبوتروں کی ڈار تتر بتر ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

Alone

میری آنکھ موبائل کے آلارم کے چیخنے پر کھلی میں خلاف عادت بہت زیادہ ہڑبڑا کر اٹھی اور آلارم آف کیا، لیٹے لیٹے میسج دیکھے لیکن موبائل اس بارے میں بالکل خاموش تھا آج تو کسی موبائل کمپنی نے بھی مجھے میسج نہیں کیا تھا۔ واش روم گئی دانت برش کرنے کے لیے جیسے ہی میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو ٹوتھ برش کے ہولڈر میں مجھے اپنا برش تنہا تنہا نظر آیا۔ کچھ سال پہلے کی یاد آئی جب میرے برش ہولڈر میں میرا برش تنہا نظر آتا ہے پھر اس کا ساتھ دینے ایک اور قدرے بڑا اور خوبصورت برش آ گیا۔ لیکن آج پھر یہ منظر اکیلا ہو گیا تھا میرا ٹوتھ برش اپنے ہولڈر کے ساتھ یوں لگ رہا تھا جسے کوئی سپیس شپ کسی بے آباد سیارے میں تنہا رہ گیا ہو اُسے گھر سے گئے آج ایک مہینہ ہونے کو تھا۔ جاتے ہوئے وہ اپنی ہر چیز لے گیا۔ یہاں تک کے واش روم میں پڑا وہ اپنا ٹوتھ برش اپنے شیمپو، کنڈیشنر اپنے ساتھ لے گیا، کمرے میں موجود ہر وہ چیز جو اسکی ذات کے ساتھ منسلک تھی جیسے کہ اس کا تولیہ، ہاتھ کی انگوٹھیاں، دوائیاں، کتابیں، کاغذات کپڑے سب کچھ۔ بیڈ کی وہ سائیڈ جہاں وہ سوتا تھا بالکل یوں تھی جیسے کرائے دار عجلت میں اپنا ساز و سامان اُٹھا کر لے جائے۔ ٹوتھ برش کو واپس رکھتے ہوئے مجھے تنہائی اور اکیلے پن کا احساس ہر صبح ہوتا تھا، کمرے میں واپس آ کر ہر روز ایسا ہی محسوس کرتی جیسے یہاں سے کسی نے ہجرت کر لی ہے

جب کوئی انسان ہمارے زندگی سے نکلتا ہے تو جسمانی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس کی روح بھی چلی جاتی ہے اور دُعا سے اُس کا نام میں نے ایسے کمپیوٹر ایز ڈ طریقے سے ڈیلیٹ کیا کہ کبھی زبان پر بھی نہیں آ رہا تھا۔ میرا بیٹا بیڈ پر تنہا سو رہا تھا اُس نے اپنی ٹانگیں اپنے باپ کی جگہ پر رکھی تھی گویا وہ اس کی جگہ لینے کی کوشش کر رہا تھا صبح دفتر سے نکلنے سے پہلے تو اب کوئی مجھے کہنے والا تھا کہ پلیز مجھے بھی چائے دیتی جانا۔ اس لیے آپ دفتر جانے سے پیش تر مجھے کوئی خاص کام نہیں ہوتا تھا۔ نہ ناشتہ، نہ کپڑے تیار کرنا، نہ واش روم میں کچھ رکھنا سارے معاملات مختصر ہو گئے تھے لیکن دوسری طرف یوں لگ رہا تھا کہ دُنیا کے اِس بھرے بورے میلے میں کسی نے مجھے یک لخت دھکا دے کر داخل کر دیا ہو، جہاں ہر طرف لوگ ہی لوگ ہیں انجان لوگ انجانی شکل، نہ تو مجھے راستہ کا پتہ اور نہ کہ کوئی آشنا صورت اس میلے میں نظر آ رہی ہے سر پر یکدم سے تیز دھوپ آ کھڑی ہو۔ بل کون جمع کرائے گا۔ گاڑی کا کام کروانا ہے، مستری کی ورکشاپ پر گاڑی کی سروس کروانی ہے۔ لمبی لائن ہے ماموں کے بیٹے کی شادی آ رہی ہے، فوٹو شوٹ میں کیا ہو گا، بچوں کے سوالوں کے جواب ناقابل تسلی دینے پڑتے ہیں، کیا میرا بڑھاپا بھی ماں جیسا تنہا اور طویل ہو گا۔ راستے

نوین روما

بھر یہی سوال نظر آئے کبھی بھکاری یہ سوال مجھ سے کر رہے ہوتے کبھی ٹریفک کی سگنل لائٹس مجھ سے یہ پوچھتیں، آج کا دن میرے لیے بڑا اہم ہے آج میرے بیٹے کی سالگرہ ہے میرا بیٹا میرا روشن ستارہ۔ کتنی دعاؤں سے ہوا اور اسکی پیدائش سے پہلے ہی اس کا نام سوچ لیا تھا کتنے پلانز تھے ہمارے آج کے دن کو لے کر۔۔ لیکن جس طرح سے حکومتیں گر جاتی ہیں تاج و تخت لمحوں میں تہس نہس ہو جاتے ہیں ایسے یہ ایک رات آگئی اور میری زندگی میں ہمیشہ کے لیے مارشل لاء کا نفاذ ہو گیا۔ یہ دن میرے لیے خوشیوں سے بھرا ہوتا تھا اتنا کٹھن اور دشوار کیسے ہو گیا۔ بیٹے کی سالگرہ پر اکیلے میں رشتے داروں، دُنیا والوں کو کیا منہ دیکھاؤں گی؟ ان کے سوالوں کے جواب کیا ہوں گے اور کیسے میں ان سب باتوں کا سامنا کر پاؤں گی؟۔ اتنی طاقت کہاں ہے میرے دل میں، دفتر میں سارا دن یہی سوچنے میں گزرا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ سب کچھ تیار ہے مہمان آ رہے ہیں، سب تیار ہو رہے ہیں کھانوں کی خوشبو ہر طرف پھیل رہی ہے اور میں شاور کے بہانے واش روم سے نکل ہی نہیں رہی، ایک ڈر ہے بس جو میرے ساتھ ہے میرے پاؤں ٹھنڈے ہوتے جا رہے ہیں، کہیں میری موت تو واقع نہیں ہونے لگی۔ مجھے بچپن میں کسی نے بتایا تھا کہ بیٹا انسان کے پیروں میں ساری طاقت ہوتی ہے جو ہمیں یہاں سے وہاں تک لیے پھرتی ہے، اسی لیے کہتے ہیں نہ کہ سر ٹھنڈا اور پاؤں گرم ہونے چاہیں۔ ساری طاقت انہیں میں ہے اور اس وقت میرا سر برف جیسا جا رہا ہے، نہیں میں ابھی مرنا نہیں چاہتی لیکن میرا حوصلہ کیسے بڑھے کیا دیکھ کر میں بڑا دل کر سکوں وہ تو اپنی کوئی

چیز، کوئی یاد بھی یہاں نہیں چھوڑ کر گیا ایک ایک چیز چن چن کر لے گیا تا کہ مجھے اسکی یاد بھی نہ آ سکے ابھی میں اپنے ٹھنڈے پیروں کو پکڑے بیٹھی تھی کہ واش روم کے دروازے پر چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کسی نے دستک دی،،، ماما آ جاؤ، آ جاؤ نا۔۔ میرا روشن ستارہ میرا بیٹا باہر سے مجھے آواز دے رہا ہے میں نے جلدی سے باہر جانا چاہتی ہوں سے بالکل انتظار نہیں کروانا چاہتی۔ چاند کی مانند چمکتا ہوا اپنی روشن آنکھوں سے وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں باہر آنے کے لیے اپنے جوتے تلاش کرنے لگی اتنے میں پتہ نہیں کہاں سے میرے بیٹے نے صوفے کے پیچھے پڑے اپنے باپ کے سلیپرز نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے نہ جانے وہ انہیں لے کر جانا کیسے بھول گیا تھا؟،، میں نے سلیپرز میں پاؤں رکھے تو میرے بیٹے نے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا، ماما، بابا بن گئی، ماما بابا بن گئی۔۔ اس لمحے مجھے اس کے ہونے کی طاقت اپنے اندر منتقل ہوتے ہوئے محسوس ہوئی، مجھے کسی نے بتایا تھا کہ جب ہم مر جاتے ہیں تو جان پیروں سے نکلتی ہے۔ جب ہمارے تعلق کی موت واقع ہوئی تو اس کی جان نکلتے وقت ساری طاقت اس کے پیروں میں رہ گئی اسکے جوتے پہن کر وہ میں نے اپنے اندر منتقل کر لی۔ کیک کاٹتے ہوئے میرے اردگرد کوئی نہیں تھا اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر میں نے جب چھری سے کیک کاٹا تو تالیوں کے شور اور کیمرے اور موبائل کے فلش لائٹ سے نہ تو مجھے کچھ نظر آیا نہ کچھ سنائی دیا کیونکہ اب میں اس کے حصے کی ساری تھکن اپنے اندر منتقل کر چکی تھی جو میرے پیروں کی طاقت تھی۔

☆☆☆☆☆

جھولا

محمد آفتاب تابش

چودھری صاحب کا ایک ہی بیٹا تھا اس کو بھی جواء کھیلنے کی ایسی لت پڑی کہ باپ کی وفات کے وقت گھر سونے چاندی کے برتنوں اور نقدی سے بھرا تھا لیکن کچھ ہی سالوں میں سارا مال واسباب جوئے کی نذر ہو گیا۔ اب لے دے کے ان کے پاس صرف اپنے حصے میں آئی ہوئی زمین رہ گئی تھی۔ چودھری کے بھائیوں نے ساز باز کر کے زرعی زمین اپنے نام کروالی تھی اور وہ زمین جو تقریباً بنجر تھی چودھری کے بیٹے کو تھما دی تھی جس کی قیمت کچھ خاص نہ تھی، لیکن اس زمین کے وسیع حصے پر نہایت قد آور اور گھنے درخت ضرور موجود تھے، نہ جانے کیوں چودھری کے بھائیوں کا دھیان اس طرف کیوں نہ گیا یا پھر وہ اپنے بزرگوں کی طرح درختوں کا کاٹنا معیوب سمجھتے تھے ورنہ وہ یہ زمین کبھی چودھری کے بیٹے کو نہ دیتے، خیر جو بھی تھا چودھری کے ہاتھ ایک طرح کا خزانہ آ گیا تھا۔ ان درختوں میں زیادہ تر بیری کے بڑے بڑے درخت تھے جن کی شاخیں زمین کو چھوتی تھیں اور بارش کے دنوں میں اکثر چرواہے اس کے نیچے سکون پاتے تھے۔ تہوار و پر ان درختوں کے

ساتھ جھولے لگتے اور گاؤں کے چھوٹے بڑے، مرد و خواتین سبھی وہاں جمع ہوتے۔ ان درختوں کے سائے میں نہ جانے کتنی محبتیں اور جوانیاں پروان چڑھی تھیں، کتنے لبوں کی مسکراہٹ اور کتنے ہی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھے تھے یہ درختوں، ان بے لوث جذبوں کے چشم دید گواہ تھے لیکن پھر بھی خاموش تھے!

چودھری کے بیٹے نے جوئے میں ایک کثیر رقم ہار دی تھی، اس پر اس قدر قرض چڑھ گیا تھا کہ گھر میں فاقوں کی نوبت آئی تھی۔ ایک دن یوں ہی اسے خیال آیا کہ یہ درخت کون سا اسے کچھ دے رہے ہیں، کیوں نہ انھیں بیچ ڈالا جائے، جتنی سرعت سے یہ خیال اس کے ذہن میں آیا تھا اس سے کئی گنا زیادہ تیزی سے اس نے اس کو عملی جامہ پہنایا۔ دوسرے دن درخت کاٹنے والی مشین کا شور سن کر لوگ اس طرف دوڑتے چلے گئے اور جن کی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ جوان ہوئے تھے، ان درختوں کو کٹتا ہوا دیکھ کر نہ جانے یوں آب دیدہ ہو گئے اور چودھری کے بیٹے کو لعن طعن کرنے لگے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ گھنے اور قد آور درخت زمین پر یوں پڑے تھے جیسے کسی جنگ کے بعد لاشوں سے بھرا میدان...... کچھ درختوں کی شاخوں میں ابھی تک جھولوں کی رسیاں موجود تھیں اور کہیں کہیں شوخ رنگوں کے رومال بھی بندھے ہوئے تھے جو غالباً درختوں کی اوپری شاخوں پر نشانی کے لیے باندھے گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جگہ بے آب و گیاہ صحرا میں بدل گئی، ہر دل اداس تھا لیکن چودھری کا بیٹا خوش تھا کیوں ان درختو ں کو بیچنے کے بعد اسے خطیر رقم ہاتھ لگی تھی جس سے اس کا قرض بھی اُتر گیا تھا اور کافی ساری رقم بچ بھی گئی تھی۔ کچھ ہی دن بعد عید بھی تھی اس لیے اس بار اسے پچھلی عید کی طرح اپنے بچوں کے لیے نئے کپڑوں کی پریشانی نہیں تھی۔ پچھلے سال اس کا چھوٹا بیٹا بہت رویا تھا کہ اس کے دوستوں کی طرح اس کے پاس نئے کپڑے کیوں نہیں ہیں۔ چودھری کا بیٹا خوش تھا کہ اس بار وہ اپنے بیٹے کے آنسو نہیں دیکھے گا لیکن جب عید آئی تو اس کے چھوٹے بیٹے نے رو رو کر خود کو ہلکان کر لیا کہ اسے جھولا جھولنا تھا، پچھلی عید کی طرح اپنے بہن بھائیوں اور گاؤں کے دوسرے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ...... لیکن جھولا لگانے کے لیے کوئی درخت تو بچا ہی نہ تھا۔ نت نئے کھلونوں اور نئے کپڑوں کے ساتھ اسے بہلانے کی بہت کوشش کی گئی مگر اس کی آنکھوں سے آنسو اور ننھی زبان سے ''جھولے'' کا لفظ نکلنا نہ رک سکا۔ چودھری سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور گھر سے باہر نکل گیا......

☆☆☆☆☆

بند مٹھی میں دُنیا

کافی دیر سے آنکھیں نمکین پانی نکال نکال کر تھک چکی تھیں، سُرخی آہستہ آہستہ ان میں ڈیرہ جمانے لگی تھی۔ حلق میں کانٹے سے اُگ کر چُبھ رہے تھے۔

"امی ی ی ی ی.....!" اندر کا درد منہ سے سسکاری بن کر خارج ہوا تھا۔

اس نے سر کو تھام کر ویران نظروں سے اوپر آسمان کی جانب دیکھا، اب اس کی آنکھوں میں ایک سوال بھی نظر آ رہا تھا۔

"میرے خدا! اتنی جلدی کیوں چھینا تو نے مجھ سے میری ماں کو، باپ کو تو تُو نے میرے پیدا ہوتے ہی اپنے پاس بُلا لیا تھا!" وہ آنکھیں اوپر کیے چلا چلا کر پوچھ رہی تھی۔ جسم کا سارا خون نچڑ کر آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی طرح آسمان پر بھی سُرخی چھائی ہوئی تھی، دونوں ہم رنگ ہونے لگے تھے۔

اسے کسی پل بھی سکون نہیں مل رہا تھا، ہر گزرتا لمحہ اس کیلیے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا۔

"میری امی ی ی ی ی.....!" وہ پاگل ہوئی بیٹھی تھی۔ اسے سکون چاہیے تھا، جو صرف ماں ہی دے سکتی تھی، اسے سکون چاہیے تھا جو اس کی ماں کی یادیں دے نہیں رہی تھیں۔

"امی ی ی ی ی.....!" وہ جھولنے لگی۔

"امی! آپ کو مجھ کو چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے تھا، یا پھر مجھے اپنے ساتھ لے کر جانا چاہیے"۔ نظروں کے سامنے وہ منظر چلنے لگا جس میں اس کی ماں بیماری کے باعث اپنی جان موت کے فرشتے کے حوالے کر رہی تھی، اور وہ بے بس سی ٹھہری صرف آہ پکار کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

سلمان یوسف سمیجہ

"مجھے سکون چاہیے، مجھے سکون کیوں نہیں مل رہا؟؟" وہ زمین پر زور زور سے مکے مارنے لگی۔

"مجھے نیند کیوں نہیں آتی؟ مجھ سے نیند کیوں رُوٹھ گئی ہے؟" کافی دنوں سے نہیں سوئی تھی۔ سونا چاہتی مگر سو نہ پاتی، ماں کی یادیں سونے نہ دیتی تھیں۔ جیسے ہی بستر پہ لیٹتی، یادوں کے کانٹے پورے جسم میں چبھ کر بے چین کردیتے، سارا سکون اور نیند چھین لیتے۔

"مجھے نیند چاہیے، سکون کی نیند"۔ وہ نظریں دوبارہ آسمان پر مرکوز کر کے گویا فریاد کرنے لگی۔

"یہ مائیں کیوں مر جاتی ہیں؟ پیچھے اولاد کو بھی جیتے جی مار کر چلی جاتی ہیں۔ امی ی ی ی ی......!!!" دردیلی چیخ دوبارہ حلق سے نکلی تھی۔ پورا یتیم خانہ اس چیخ سے گونج اُٹھا۔

"ارے لڑکی! کیوں رو رہی ہو؟ لگتا ہے پھر تمہیں دورہ پڑ گیا ہے"۔ بوڑھی ایڈمن آ کر اسے اٹھانے لگی۔

"چلو اندر چلو"۔ وہ اسے تھام کے اندر لے آئی۔

"مجھے سکون چاہیے، جو میری امی مجھے دے سکتی ہیں، مجھے پُرسکون نیند چاہیے، جو صرف مجھے امی کے تھپکنے سے آ سکتی ہے"۔ وہ دیوانہ وار کہہ رہی تھی۔

"چپ... چپ...!" اسے پیار بھرے دلاسے کے ساتھ چپ کرایا جانے لگا، جیسے چھوٹے سے بچے کو کراتے ہیں!

بستر پر تو وہ لیٹ گئی، مگر نیند ہنوز غائب تھی، سکون روٹھ گیا تھا۔

بستر پہ پڑے پڑے گھورتی نگاہیں اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے اچانک فرش پر پڑے چھوٹے سے چاک کے ٹکڑے پر پڑی۔ اس کی ویران آنکھیں چمک ہی تو پڑی تھیں، اسے لگنے لگا جیسے ہفت اقلیم کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ وہ فوراً اُٹھ کر چاک کے ٹکڑے کی جانب بڑھی۔

چاک کو ہاتھوں میں لے کر وہ مسکرائی اور فرش پر ایک خاکہ بنانے لگی۔ خاکے کے منہ پر ایک ممتا بھری مسکراہٹ سجانے کے بعد وہ اور زیادہ مسکرا اٹھی۔ خاکہ بالکل تیار تھا۔ وہ خاکے پہ بنی آغوش پر لیٹی اور سو گئی، اب اسے لگا جیسے اسے سکون مل رہا ہو، وہ ماں کی گود میں ہو، اس نیروٹھی نیند کو منا بھی لیا تھا۔ پہلے تو وہ وہ "ماں" کی آغوش میں تھی، اب نیند نے بھی اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

چاک کا ٹکڑا اب بھی اس کی مٹھی میں دبا تھا، وہ اب اور بھی کئی ایسے خاکے بنا سکتی تھی، اس کی مٹھی میں چاک نہیں، اس کی پوری دنیا دبی ہوئی تھی!

☆☆☆☆☆

بھوک کے مارے لوگ

ہیبت ناک شب نے تاریک ماحول کے اوپر تنی اپنی سیاہ ردا لپیٹ کر اٹھالی تھی - اجالے کے قافلوں کو اذن باریابی مل چکا تھا - بہشت سے معطر ہواؤں کو کوچ کا حکم ہو چکا تھا - بادنسیم کے مست جھونکے اٹھکیلیاں کرتے بستی کی جانب بڑھ رہے تھے - پہاڑی جھرنے گنگنا اٹھے تھے - سرسر کرتی ہوائیں درختوں کی نازک شاخوں اور پتوں کو جھولا جھلاتی مترنم آبشاروں کی ہمنوا بن کر دلفریب دھنیں ترتیب دے رہی تھیں - فرشتوں نے حسن وزیبائی سے بھری ٹوکری فلک سے نیچے الٹا دی تھی - گاوں کے اطراف میں مظبوط محافظوں کی طرح جمے پہاڑ سفید برفیلی دستار سر پہ لپیٹے تن کے کھڑے ہو چکے تھے اور ان کے اوپر سے سنہرے روپہلے بادلوں کے پرے پلکیں جھپکائے بغیر یوں نیچے جھانک رہے تھے جیسے وہ کوئی حسین سہانا سپنا دیکھ رہے ہوں - سنہری آڑھی ترچھی کرنیں برساتا سورج اب کھل کر سامنے آچکا تھا اور پورا گاوں صبح کی ٹھنڈی روشنی میں نہا رہا تھا - گل خان چرواہے کی بھیڑ بکریاں قدم قدم اوپر چڑھتے اب پہاڑ کے بیچوں بیچ سبزے تک پہنچ کر پہاڑ کی ڈھلوانی سطح پر پھیل چکی تھیں اور وہ اب دور سے یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے روئی کی بے شمار چھوٹی چھوٹی گانٹھیں حرکت کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہوں - اونچے ہموار بڑے چٹان کے اوپر بیٹھ کر گل خان نے بانسری کے تان اڑائے تو نیچے وادی میں پہاڑی چشمے سے گاگر بھرنے والی شازیہ کا دل دھک سے رہ گیا اور اس کی نظریں بے اختیار اوپر پہاڑی کی جانب آٹھ گئیں - گھاس کا گٹھڑ سر پہ رکھے آہستہ سے پتھریلے راستے پہاڑ سے اترتا بابا عظیم اور ان سے زرا نیچے دو نوجوان لڑکے سوختنی لکڑیوں کے گٹھے اٹھائے اترتے ہوئے گاوں کی جانب بڑھ رہے تھے -

یہ تھا موضع احمد کوٹ ؛ کہنے کو تو یہ ایک گاؤں کا نام تھا مگر زمین پر جنت کا ٹکڑا دکھائی دیتا تھا - کہا جاتا ہے کہ اس کے حسن کا تماشا دیکھنے کے لئے پرستان سے پریاں اترتی رہتی تھیں - تروتازہ ہوائیں، دلفریب سبزہ، سحر انگیز محل وقوع اور دلکش نقشہ اسے جنت ارضی بنائے ہوئے تھا - دو ڈھائی سو کچے پکے مکانات پر مشتمل اس گاؤں کی آبادی بارہ تیرہ سو نفوس

نور کمال شاہ

کے لگ بھگ تھی- پہاڑی علاقے میں واقع ہونے کے باوجود گاؤں ہموار میدانی رقبے پر پھیلا ہوا تھا؛ جس کے چاروں طرف کوسوں دور تک ہموار، زرخیز اور سرسبز کھیت موجود تھے- یہ ہرے بھرے کھیت اب تک اپنے باسیوں کے لئے گندم، مکئی، سرسوں، تمباکو اور گنے کے بڑی فصلوں کے علاوہ مختلف انواع واقسام کی سبزیوں کی فراہمی کی ذمہ داری بطریق احسن انجام دیتے آئے تھے- پہاڑوں سے اتر کر آنے والی صاف ستھرے پانی کی ندی اور اردگرد استادہ لاتعداد بلندوبالا درخت بھی اس کے حسن میں مزید اضافہ کررہے تھے- یہ ندی گاؤں کے بالکل سامنے سے گزرتی تھی -ندی کے پانی میں لڑکیاں کپڑے دھونے آتی تھیں اور نوجوان سہ پہر کو کنارے موجود ریت میں کبڈی کھیلا کرتے تھے- دلبری اور دلداری کے تماشے بھی یہاں ہی دیکھنے میں آتے -گاؤں کا حسن گھروں کی چاردیواری پار کرکے ندی کے کنارے کھلی فضاؤں میں اتر آتا تو جوانی کے جوش میں مست پتنگے خود کو وارنے وہاں پہنچ جاتے -نظروں کے تیر چلتے اور کلیجے پھٹ کے رہ جاتے - گاؤں سے ملحق ایک وسیع میدان میں بلندوبالا گھنے درختوں کا جھنڈ جن کی اونچی مظبوط شاخوں میں رسیاں پھنسا کر چار پانچ جھولے بنائے گئے تھے-سہ پہر کو گھر کے کام کاج نمٹا کر گل اندام دوشیزائیں جھولا جھولنے یہاں پہنچ جاتیں- سروں کو ڈھکے سرخ، نیلے، سبز، اودے اور زرد دوپٹے جھولتے ہوئے یوں ہوا میں لہراتے جیسے کسی نے حجلہ عروسی میں بے شمار رنگین پردے اویزاں کئے ہوں-ندی کے پار ایک وسیع، کھلے اور ہموار سبز میدان میں گاؤں کے بچے کھیلنے جمع ہوتے -ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کھیلتے اور عجیب دلکش رونق جمی رہتی- شام کے وقت یہاں کا نظارہ دیدنی ہوتا - کھیتوں اور میدانوں سے آگے پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جہاں گاؤں کی ضروریات کی بیشتر اشیاء وافر مقدار میں موجود رہتی تھیں-لکڑی، گھاس، جڑی بوٹیاں، سنگ مرمر اور عمارتی پتھر وغیرہ سب ان ہی پہاڑیوں سے گاؤں میں پہنچتا تھا -دودھ اور کھیتی باڑی کے لئے پالے گئے پالتو جانور اونٹ، بیل، گائے اور بھیڑ بکریاں ان ہی پہاڑوں میں چرا کرتی تھیں -

یہ زمیندار لوگ تھے اور کھیتی باڑی ہی ان کا ذریعہ معاش تھا- چند لوگ شہر یا دوسرے قصبوں میں کام کرنے اور روزی کمانے بھی جایا کرتے تھے- احمد کوٹ کے رہنے والے کسانوں کے مکانات بڑے بڑے مگر گلیاں تنگ تھیں-آپس میں پیار ومحبت کا زمانہ تھا اور لوگ مخلص، ملنسار اور ایک دوسرے کے ہمدرد تھے- ایک ساتھ رہنا پسند کرتے تھے، شائد اسی لئے گلیاں تنگ اور چھوٹی رکھی گئی تھیں تاکہ آپس میں فاصلہ کم سے کم رہے -دوپہر یا شام کے وقت

ایک گھر میں تندور گرم کیا جاتا تو پورے محلے کی خواتین اس میں روٹیاں پکانے وہاں پہنچ جاتیں - گاڑیاں اس زمانے میں کہاں؛ ہاں کچی سڑک البتہ موجود تھی- جو متمول یا دور دراز کے علاقے میں کام کرنے والے افراد تھے، وہ سائیکل سے کام چلایا کرتے تھے اور سائیکل کے لئے وسیع اور کھلی گلیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی - ویسے بھی گلیوں میں سائیکل چلانا معیوب سمجھا جاتا تھا - اس لئے سائیکل والے آبادی سے نکل کر ہی اس پر سوار ہونا پسند کرتے تھے- سائیکلیں بھی کیسی..... وہی بطرس بخاری والی مرحوم سائیکلیں، جن کے پہیے ٹھیک تو بریک ندارد اور سیٹ ٹھیک تو پیڈل گج رو- غربت کا زمانہ تھا سو یہ بھی غنیمت تھا - روپے پیسے اور آسائشات زندگی سے محروم آبادی پیار و محبت کے دولت سے مالا مال تھی- نفرت نام کا کوئی عارضہ انہیں لاحق نہیں تھا - چھوٹی چھوٹی رنجشیں پیدا ہو کر ساعتوں میں دم توڑ دیتی تھیں- کیوں کہ یہ سادہ دل صحرائی کوئی بات دل میں نہیں رکھتے تھے؛ بس جو ہو گیا، گزر گیا؛ آئندہ یہ موضوع سخن نہیں رہے گا- ایک بڑی مسجد اور ایک ہی حجرہ ان کی اجتماعیت کی نشانی تھی - چھوٹے بڑے سب ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے اور ایک ہی حجرے میں اکھٹے ہوتے - کنوارے نوجوان جو ابھی شادی کے بندھن سے آزاد تھے، حجرے ہی میں سوتے اور صبح اٹھ کر گھر چلے جاتے - شادی کے بعد البتہ ان کا مسکن تبدیل ہو جاتا - رات کو گاؤں کے بزرگ بھی حجرے میں حاضری دینا ضروری سمجھتے - دیر تک ان کی محفل جمی رہتی- آپس میں ہنسی مذاق اور قصے کہانیوں کے دور چلتے؛ دن بھر کی روداد بیان ہوتی اور خاصی رات گئے یہ بزرگ گھروں کی راہ لیتے - نہ چوری کا ڈر اور نہ ہی قتل مقاتلے کی وارداتیں - ان کے اکثر کام بھی اجتماعی ہوتے - بوائی کے دنوں میں سب ایک دوسرے کے مددگار ہوتے تو کٹائی بھی مشترکہ ہوتی - پندرہ بیس بندے مل کر کھیت کاٹنے بیٹھتے تو گھنٹے بھر کے اندر کھیت کے پار نکل جاتے- فصلیں اور نسلیں دونوں ہی خوب پروان چڑھ رہی تھیں- اتفاق ہی کی برکت تھی کہ یہاں کے کھیت ہمیشہ لہلہاتے رہتے اور اتنا اناج پیدا ہو جاتا جو احمد کوٹ کے ساتھ ساتھ کئی اور علاقوں میں پہنچ جاتا بلکہ شہر تک بھی پہنچ جاتا- سبزیاں، دودھ، دہی، اور لسی تقریباً" ہر گھر میں موجود ہوتی - کھانے پینے کے الجھنوں سے بے نیاز دیہاتیوں کے دل میں اکثر شہر کی رنگینیوں، رونقوں اور سہولتوں کے سپنے جھلملاتے اور وہ ترقی کے خواب دیکھنے لگتے مگر گاؤں میں شہر جیسے حالات کہاں..... پھر بھی وہ خواب دیکھتے کیونکہ خوابوں پر کوئی پابندی نہیں ہوتی - ترقی کا خواب دیکھنے والوں میں نوجوان

سب سے آگے تھے۔

عالم رنگ و بو میں ثبات فقط تغیر کو حاصل ہے۔ تبدیلی تو ہر حال میں آنی ہی تھی۔ حالات تو جلد یا بدیر ایک دن بدلنے ہی تھے۔ آسائشات، سہولیات اور ترقی سے محروم احمد کوٹ کے باسی بالآخر ترقی کو اپنے گاؤں تک کھینچ لانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ شہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے گاؤں کے سپوت ترقی و خوشحالی کا نقشہ لے کر ہی لوٹے؛ پکے گھر، تارکول سے سیاہ سڑکیں، نلکوں کا پانی، پکی گلیاں، بڑے بڑے سکول، چھوٹا سا ہسپتال اور ماڈرن زندگی......

یہی تو ان کا خواب تھا......

یہی تو جدید دور کا تقاضا تھا......

اور یہی دنیا سے برابری و ہمسری کا راستہ تھا......

جائداد کے لحاظ سے چچا احسان پورے گاؤں میں سب سے بڑھ کر تھے۔ اس کی جائداد زیادہ بھی، انتہائی زرخیز بھی اور گاؤں کے پاس ہی واقع تھی۔ ان کے زرخیز کھیتوں میں فصلیں بھی کمال کی پیدا ہوتی تھیں؛ ان کی اپنی ضروریات سے کہیں بڑھ کر۔ اپنی ضروریات نکال کر بقیہ اناج گاؤں والوں کو مناسب قیمت پر بیچ دیتے تھے۔ اس کا بیٹا محسن پچھلے تین چار سال سے شہر میں ڈاکٹری پڑھ رہا تھا۔ ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا تھا۔ جب بھی چھٹی پر گاؤں آتا، ڈھکے چھپے الفاظ میں شہر کی آسائشات، سہولیات اور اپنے گھر اور گاؤں کی پسماندگی کا ذکر ضرور چھیڑتا۔ گاؤں میں اپنے دو تین کمروں کے گھر اور کمتر معیارِ زندگی کا رونا روتا۔ ان کے گھر کا احاطہ تو بڑا تھا مگر رہائشی کمرے تین ہی تھے جس میں خاندان کے دس افراد رہتے تھے اور اپنے ساتھ کافی مویشی بھی رکھتے تھے۔ آدھا گھر تو ان ڈھور ڈنگر نے گھیر رکھا تھا۔ محسن بالآخر ماں کو رام کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ماں کے بعد باپ کو بھی راضی ہونا ہی پڑا۔ چچا احسان نے یہ کہتے ہوئے گھر والوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے؛

"ٹھیک ہے نیک بختو! اگر تمہاری یہی ضد ہے تو مجھے کیا؛ جو مرضی کرو"۔

چنانچہ گاؤں سے باہر اپنے کھیتوں میں برلب سڑک ایک کنال زمین پر نئے گھر کی بنیادیں رکھ دی گئیں۔ تعمیری لاگت سے نمٹنے کے لئے مزید تین کنال زمین بیچ دی گئی اور چند ماہ بعد ہی شاندار گھر بن کر تیار ہو چکا تھا۔ نئے گھر میں چھ کمرے، کچن، باتھ روم اور لان بنائے گئے جس میں مختلف قسم کے پھول اور پھل پودے عجب بہار دکھانے لگے۔ مویشیوں کے لئے رہائشی کمروں سے ذرا ہٹ کر بڑا کمرہ تعمیر ہوا۔ بڑا گیٹ نصب کر کے گاڑی کے داخلے کا راستہ بنایا گیا تاکہ گاڑی لینے کے بعد اسے گھر کے اندر لایا جا سکے۔ مکمل ہونے کے چند دن بعد ہی یہ لوگ اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئے۔

" خاندان میں اب ہماری ناک تو مت

کٹوائیں نا ملک جی! آخر برادری کو کیا منہ دکھائیں گے؟" مرجانہ نے بھی اپنے شوہر کی غیرت کو جھنجوڑا -

محسن کی چچی مرجانہ کے لئے یہ سب ناقابل برداشت تھا - یہ کیسے ممکن تھا کہ دیورانی جی تو ٹھاٹ سے نئے گھر میں رہیں اور وہ پرانے کھنڈر میں بیٹھی رہے، چنانچہ اس نے بھی اپنے شوہر کے کان کھانے شروع کر دیئے - گھر کی تنگ دامنی کے قصے چھیڑے جانے لگے؛ بیٹے بھی اس کے ہمنوا بن گئے اور یوں چچا جان کے لئے مزید دباؤ برداشت کرنا مشکل ہو گیا اور آخر کار اسے ان کی ضد کے آگے جھکنا پڑا - وہی قصہ دہرایا گیا اور جلد ہی یہ لوگ بھی اپنے نئے گھر میں جا کر آباد ہو گئے - روایت ڈال دی گئی تھی اور اب اس روایت کی تقلید اور پاسداری تو ہونی ہی تھی -

علی زمان دس بارہ سال سے سعودی عرب میں مقیم تھے اور خوب پیسے کما رہے تھے؛ - پیسے بچا کر اس نے گاؤں میں تھوڑی سی زمین بھی خرید لی تھی - ان کا اپنا مکان بھی اتنا کچھ برا نہیں تھا - مگر اب کی بار وہ وطن لوٹا تو اس کے دل میں نئے اور بڑے گھر کی آرزوئیں مچلنے لگیں - اسے اپنا گھر بہت چھوٹا اور بدنما محسوس ہونے لگا؛ چنانچہ سعودی عرب لوٹنے سے پہلے ہی اس نے اپنا نیا گھر مکمل کر دیا اور گھر والوں کو وہاں منتقل کر کے پردیس سدھارے -

ترقی کا دور شروع ہو چکا تھا - وقتے وقتے سے لوگ گاؤں کے باہر منتقل ہوتے رہے اور زرخیز زرعی زمینوں پر نئے گھر بناتے رہے - کھلی اور پکی گلیاں بنتی گئیں، سرکار نے سڑک بھی پکی کرائی اور پانی کی بڑی ٹینکی بھی گاؤں میں بن گئی مگر زرعی قطعات تیزی سے گھٹتے رہے - زمان و مکان کے فاصلے تیزی سے سمٹنے لگے اور فقط چالیس پچاس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد احمد کوٹ میں صرف پہاڑیوں کے آس پاس واقع بنجر، کم زرخیز اور پتھریلی زمینیں باقی رہ گئیں - ترقی کے نام پر بڑے بڑے سکولوں، کشادہ سڑکوں اور ہسپتال و دیگر سرکاری عمارتوں کے لئے بھی بہت سا خطہ زمین گھیرا گیا - اور اب آبادی و عمارات بڑھنے سے چھوٹا سا احمد کوٹ بڑے قصبے میں تبدیل ہو چکا تھا، جہاں سڑکوں پر پھوں پھوں کرتی گاڑیاں اور موٹر کاریں تیزی سے دوڑتی نظر آتیں - کاروبار اور لین دین کے لئے بڑی بڑی دکانیں، مارکیٹیں اور پلازے تعمیر ہوئے - ترقی کے دلدادہ محسن اور ان جیسے نوجوان مزید ترقی کی خاطر شہر میں ہی جا بسے تھے - شہر ہی میں ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں شادیاں کر کے وہاں ہی اپنے گھر بسا کر نئی زندگی کا آغاز کر چکے تھے -

فروری کا مہینہ چل رہا تھا - احمد کوٹ کے بچے کھچے کھیت ویرانی کا منظر پیش کر رہے تھے - پچھلے سال کی طرح اس دفعہ بھی بارشیں بہت کم برسی تھیں - جو بارشیں ہوئیں تھیں وہ بھی

بے وقت اور بے موقع ثابت ہو چکی تھیں۔ پیاس سے بلکتے کھیت اپنا زور اور اثر ان چند اگے ہوئے پودوں پر نکال رہے تھے جو ابھی تنگ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے خشک مٹی کے اوپر تن کر کھڑے تھے۔ پورے صوبے میں اور خاص کر احمد کوٹ کے ارد گرد قحط کا سا سماں تھا۔ تقریباً" تمام گھروں میں غلہ ختم ہو چکا تھا۔ حکومت کوششیں کر رہی تھی مگر شدید ضرورت کی وجہ سے یہ کوششیں بے سود نظر آ رہی تھیں۔ اج بھی احمد کوٹ کے باسی پریشانی، ناامیدی اور غمگینی کی تصویر بنے نجانے امداد کے منتظر تھے۔ دن دس بجے کے قریب آٹے سے بھرا ٹرک گاؤں پہنچا۔ لوگ بھاگتے دوڑتے پہنچے اور ٹرک کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ آٹے کی تقسیم شروع ہوئی۔ ٹرک والے صاحب کے ساتھ دو مزدور آٹے کی بوریاں دینے لگے اور منشی صاحب قیمت وصول کرنے لگے۔ سینکڑوں لوگوں کو قطار میں کھڑا کر کے ان کو آٹے کی چھوٹی بوریاں تھمائی جانے لگیں۔

چچا احسان بھی سر جھکائے قطار کے بیچ میں کھڑے تھے۔ ان کے گھر میں بھی آٹا ختم ہو چکا تھا۔ دھکم پیل میں وہ بھی رل رہے تھے: اس کی باری آئی تو اسے بھی ایک تھیلا تھمایا گیا۔ مگر یہ چھوٹا سا تھیلا اس کے کنبے کے لئے بالکل ناکافی تھا۔ اپنی غیرت اور خودداری کو بھلا کر وہ آٹا تقسیم کرنے والے صاحب کے سامنے پھٹ پڑے۔ کئی سال سے اس کے اندر پکنے والا لاوا ابل پڑا۔ منہ زور آندھی کو گویا زبان مل گئی اور سرکش طوفان نے الفاظ کا روپ دھار لیا......

" صاحب جی! کس کو الزام دیں، کس کو قصوروار ٹھہرائیں؟ کس کے ہاتھوں پہ اپنے خون کے چھینٹے تلاش کریں؟ خود کو گنہگار گردانیں؛ حکومت کو الزام دیں یا اللہ سے شکوہ کریں......؟ "۔

ٹرک کے پاس موجود ہجوم دم بخود کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

:" ہم اپنا بویا ہی کاٹ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر فاقوں کے مستحق ہیں ہم لوگ ۔ ایک وقت تھا کہ ہم دوسرے علاقوں کو گندم دیا کرتے تھے۔ آج اپنی غلطیوں کے سبب دانے دانے کو محتاج ہیں۔ ہمارے بچے بھوک کے ہاتھوں بلک رہے ہیں۔ اگر ہم اس وقت تھوڑا سا عقل استعمال کرتے اور آج کے دن کا سوچتے تو آج ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ہم لوگوں نے قیمتی زرخیز زمینوں کو اینٹوں کا کفن پہنا کر بے کار کر دیا اور بنجر و بیکار زمینیں اپنے لئے رکھ چھوڑیں۔ یہ بنجر زمینیں ہمارے دفنانے کے کام تو آ سکتی ہیں مگر ہمارے پیٹ بھرنے کا وسیلہ نہیں بن سکتیں ۔ آج ہمارا حال قابلِ افسوس ہے ۔ ہمارے کھیتوں میں اگنے والی سبزیاں ہماری بھوک مٹانے کے بعد شہر میں پہنچا کرتی تھیں، مگر آج ہم شہر سے چار پانچ دن کی باسی سبزیاں منگوا کر کھانے پر مجبور ہیں ۔ یہ چھوٹا سا آٹے کا تھیلا جو آج مجھے بڑی منت سماجت کے بعد ملا

ہے، میری ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ مجھے پورا حصہ دے دیں تاکہ میرے چند دن آرام سے گزر سکیں ورنہ یہ بھی واپس لے لیں......!!!"۔

ٹرک والا دم سادھے چند لمحوں تک اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے شکن آلود چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ کا ایک سایہ سا لہرایا اور پھر چچا احسان کو مخاطب کرتے ہوئے مدھم اور نرم لہجے میں نہایت مختصر اور قطعی جواب دیا۔ بولا: "بابا جی! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر اب کیا کیا جائے۔ میرے بس میں ہوتا اور اگر صرف آپ ہی بھوکے ہوتے تو میں پورا ٹرک آپ کے صحن میں خالی کر دیتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ سب ہی بھوکے اور ضرورت مند ہیں۔ فی الحال تو اسی بوری سے کام چلا لیں کیونکہ اتنا ہی آپ کے حصے میں آسکتا ہے۔ شکر کریں کہ اتنا تو ملا۔ اگلی دفعہ کوشش کروں گا کہ زیادہ بوریاں لاسکوں؛ اور ہاں، بارش کے لئے دعا ضرور کریں"۔

چچا احسان کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ اسے اپنی زندگی سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اس نے خود کو اتنا بے بس کبھی نہیں پایا تھا۔ اس کا پڑوسی نور زمان یہ ساری کارروائی بڑے غور اور توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اسے بھی ایک ہی تھیلا ملا ہوا تھا۔ اس کے گھر میں پچھلے تین دن سے چاول پک رہے تھے کیونکہ غلہ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کے بارے میں سوچا جو روٹی کے لئے ترس رہے تھے۔ آٹے کی بوری وصول کرتے ہی اس کا چھوٹا بیٹا دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ چکا تھا۔ اس کی ماں دور کوٹھے کے اوپر کھڑی اس کا تماشہ کر رہی تھی اور شائد انتظار بھی مگر نور زمان کی غیرت اور خودداری اسے ایک اور راستہ اختیار کرنے پر اکسا رہی تھی۔ دل اور دماغ میں لڑائی جاری تھی۔

دل کا فیصلہ منظور ہوا۔ احساسات جیت گئے: خواہشات نے لمبی چادر اوڑھ لی۔ اقدار کو زندہ رکھنا ضروری تھا۔ چچا احسان کی عزت نفس کی رکھوالی کے لئے اپنے پیٹ کی قربانی ضروری ہو گئی تھی۔ پیٹ کا کیا ہے، اسے تو کسی بھی شے سے بھرا جا سکتا ہے۔ انسانیت کا مظاہرہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ نور زمان نے اپنی ٹانگیں معصوم بیٹے کے کمزور ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کیں۔ وہ اپنے آٹے کی بوری اٹھا کر قطار سے نکلا اور چچا احسان کے پاس پہنچا جو اپنی بوری کے پاس سر جھکائے مغموم کھڑے تھے۔ سارا ہجوم دم بخود کھڑا انہونی کو ہوتے دیکھ رہا تھا۔ آٹے کے تقسیم کار بھی حیرت سے قربانی کی داستان رقم ہوتے دیکھ رہے تھے۔ انہیں شائد احساس ہو گیا تھا کہ کیا واقعہ رونما ہونے جا رہا ہے تبھی تو اس کا ہاتھ سلیوٹ کے انداز میں ماتھے تک جا پہنچا تھا۔ دوسرے ہی لمحے نور زمان نے اپنی آٹے کی بوری چچا احسان والی بوری کے اوپر ڈال دی، اس کا کندھا تھپتھپایا اور خاموشی سے بغیر کچھ کہے اپنے معصوم بیٹے کا ننھا ہاتھ تھام کر خالی ہاتھوں گھر کی جانب چل پڑا۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داشان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

ڈپٹی کمشنر کے شب و روز

برطانوی سامراج نے ہندوستان میں جو مضبوط مربوط اور مستحکم انتظامی ڈھانچہ کھڑا کیا اس کی اساس جس ادارے پر رکھی گئی تھی اس کا محور و مرکز ڈپٹی کمشنر تھا۔ ڈی سی کو برٹش راج کا Eyes & ears بھی کہا جاتا تھا۔ کچھ حلقے اسے سینگوں والی سروس بھی کہتے۔ ضلع کا سارا نظام فرد واحد کے گرد گھومتا تھا۔ یہ ایک ایسا امرت دھارا تھا جو ہر انتظامی مسئلے کا واحد حل تھا اور ہر مرض کی دوا بھی۔ یہ لارڈ میکالے کے زرخیز ذہن کی پیداوار تھا جس نے اس سروس کو باقاعدہ منظم کیا۔

اس سے پہلے قریباً سو سال تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت کی۔ مٹھی بھر سوداگروں کا اتنے بڑے ملک پر بتدریج قبضہ تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسا مخمصہ ہے جس پر مورخین رہتی دنیا تک غور کرتے رہیں گے۔ تجارت کی آڑ میں انگریزوں نے آہستہ آہستہ پاؤں پھیلانے شروع کیے۔ ہندوستان اتنا بڑا ملک تھا کہ اگر سب ہندوستانی مل کر پھونک بھی مار دیتے تو وہ مٹھی بھر مچھیرے بحر ہند میں جا گرتے لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ ہندوستانیوں کی رقابتیں، مناقشتیں، تعصبات اور گروہ بندیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ہندو بوجوہ مسلمانوں سے مخاصمت رکھتا تھا۔ ہزار سال کی غلامی نے ان کے اندر غم وغصہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا اور انہیں کسی ایسے ہی نجات دہندہ کی ضرورت تھی۔ محلاتی سازشوں، تعیش اور نااہلی کی وجہ سے مغل سلطنت بھی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ دراصل جب سلاطین اپنے آپ کو مشت غبار سمجھنے لگیں اور حاکمان وقت "ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ" کا ورد کرنے لگیں تو پھر تباہی قوموں کا مقدر بن جاتی ہے۔ کچھ غیرت مند لوگوں نے حتی المقدور کوشش کی لیکن وہ بھی اپنوں کی سازش کا شکار ہو گئے۔ آخری مشکل مئی ۱۷۹۹ میں دُور ہو گئی جب سرنگا پٹم کے معرکے میں ٹیپو سلطان شہید ہو گئے اور ہندوستان پر قبضہ کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ جب لارڈ کارنوالس نے جشن فتح منایا تو ہندوستانی طوائفیں جی بھر کر ناچیں۔ جشن کے سب اخراجات ہندوؤں نے برداشت کیے۔ اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے پیروں، چوکیداروں اور خدمت گاروں کو مغل شہزادوں اور سلطان کے درباریوں کا لباس پہنا دیا۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں نے ہندوستان کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ لارڈ کلائیو نے ننگ ملت، ننگ دیں، ننگ وطن میر جعفر سے لاکھوں پاؤنڈ کا نذرانہ وصول کیا۔ ان لوگوں نے تجارت تو خیر کرنی ہی تھی لیکن اس کے ساتھ تعیش کی بھی انتہا کر دی۔ ہر افسر کے حرم میں بیسیوں حسین عورتیں ہوتی تھیں جو فرصت کے اوقات میں اس کا دل بہلاتی تھیں۔

جب ان کی دولت کے قصے انگلستان پہنچے۔ تو حیرت اور حسرت سے مقامی باشندے انگلیاں منہ میں دبا لیتے۔ الف لیلوی قصے۔ حسیناؤں کے جھرمٹ، دولت کی فراوانی، اشیائے خورد ونوش کی ارزانی، نغمہ و چنگ، بادہ گلرنگ، کمپنی کی پوسٹیں بکنے لگیں۔ مرد تو مرد انگریز عورتوں کی ڈاریں بھی ہندوستانی ساحل پر اُترنے لگیں۔ کمپنی کے افسر عیاش ضرور تھے لیکن شادی کے معاملے میں محتاط تھے۔ شادی وہ صرف انگریز عورتوں سے ہی کرتے تھے۔ یہ عورتیں اسی سلسلے میں اپنا مقدر آزمانے آتی تھیں۔ بیشتر تو کمپنی کے

افسروں کو پھانسنے میں کامیاب ہو جاتیں اور جو محروم رہ جاتیں وہ بھی کچھ نہ کچھ لے کر ہی ٹلتیں۔ ان میں ایک قابل ذکر عورت مس ہالڈین تھی۔ اتنا شادی شدہ عورتوں نے ساری عمر میں نہ کمایا ہوگا جتنی رقم اس نے چند ماہ میں بٹور لی۔ شکل چاہے کیسی بھی ہو گورے رنگ پہ ہندوستانی مر مٹتے ہیں۔ چونکہ لفظ ہندو کے لغوی معنی ہی کالے رنگ کے ہیں اس لئے یہ احساسِ کمتری اس کے ساتھ ساری زندگی کسی نہ کسی رنگ میں چمٹا رہتا ہے۔ اس نے کسی ہندو سے شادی تو نہ کی لیکن دیوی کا روپ دھار لیا اور شائقین کو ایک ٹکٹ میں دو مزے کرا ڈالے۔ دیوالی کی رات لکشمی دیوی کی پوجا کرتے وقت اگر کسی کنواری لڑکی کے برہنہ جسم پر سونے چاندی کے سکے رکھ کر پوجا کی جائے تو دیوی کو آسانی سے رام کیا جا سکتا ہے۔ اس نے کنواری کنیا کا روپ دھار لیا۔ لکشمی دیوی تو پتہ نہیں خوش ہوئی ہوگی یا نہیں لیکن پجاریوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر طرف رام دہائی ہونے لگی۔ عشاق کے دل گھڑی کے پنڈولم کی طرح پسلیوں سے جا ٹکرائے۔ چار سو نا قوس بجنے کی صدائیں آنے لگیں۔

لیکن یہ ڈرامہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ حاکموں کو اپنی تضحیک کسی صورت گوارا نہ تھی۔ ایک انگریز عورت الف ننگی ہو کر یوں داد عیش دیتی پھرے۔ ہر طرف غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اسے ہندوستان بدر کر دیا گیا۔ حال دہائی، واویلا، قانونی چارہ جوئی کچھ بھی اس کے کام نہ آ سکے۔ عدالتوں نے اس حد تک انصاف ضرور کیا کہ جو کچھ وہ کما چکی تھی وہ بھی اس کے ساتھ ہی انگلستان روانہ کر دیا۔ اس طرح ایک پنتھ دو کاج ہو گئے۔ مزید رسوائی سے بھی بچ گئے اور اینٹھی ہوئی نیک کمائی بھی مادر وطن منتقل ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ایک بات صاف ظاہر ہو گئی کہ اتنے بڑے ملک کو چلانا کمپنی کے بس کا روگ نہیں رہا۔ چنانچہ ہندوستانی حکومت کا کنٹرول سلطنت برطانیہ نے براہ راست سنبھال لیا۔ راجہ ٹوڈرمل کے ریونیو سسٹم کو تو جوں کا توں رہنے دیا گیا لیکن فوجداری نظام میں بنیادی تبدیلیاں کر ڈالیں۔ لارڈ میکالے نے تعزیرات ہند ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کی تثلیث کے عین درمیان ڈپٹی کمشنر کو لا کھڑا کیا اور اسے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا لبادہ اوڑھا کر پولیس کو بھی عملاً اس کے ماتحت کر دیا۔ ڈسٹرکٹ کلکٹر کے روپ میں ریونیو سسٹم پر بھی اس کی گرفت مضبوط کر ڈالی۔ گھر اور کار پر جھنڈے نے اس کی شان و شوکت میں مزید اضافہ کر دیا۔ یہ ایسا عہدہ تھا جسے حاصل کرنے کی خواہش یا تمنا ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے دل کے کسی کونے کھدرے میں بھی چھپی رہتی تھی۔ جتنا بڑا یہ عہدہ تھا اتنے ہی قصے کہانیاں اور لطائف بھی اس کے ساتھ

منسوب ہو گئے۔ کہتے ہیں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر دورے پر گیا تو مقامی پولیس نے ایک خطرناک اور بدنام ڈاکو پکڑ کر ڈی سی بہادر کے سامنے پیش کیا۔ فرط جذبات میں ڈپٹی کمشنر نے اپنا پستول نکال کر اسے گولی ماردی۔ ڈاکو کا جسم ٹھنڈا ہوا تو اس کے ساتھ ہی ڈی سی صاحب کا غصہ بھی سرد پڑ گیا۔ انہیں احساس ہوا کہ غصے میں ان سے ایک بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہے۔ ان دنوں قانون بہرحال قانون ہوا کرتا تھا موم کی ناک نہیں تھا۔ اس میں ہنوز چمک دمک بھی نہ آئی تھی۔ چنانچہ اس نے سول سرجن کو بلا کر کہا Write, that he died of cholera ڈاکٹر نے ایک نظر ڈاکو کے مردہ جسم پر ڈالی اور دوسری سے ڈی سی صاحب کو دیکھتے ہوئے بولا "حضور! اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی موج خوں آپ کے دست غیض تک آن پہنچی ہے۔ آپ قتل عمد کے مرتکب ہوئے ہیں۔ میں کیسے لکھ دوں کہ یہ کالرہ سے مرا ہے۔" اس پر ڈپٹی کمشنر نے ایک فیصلہ کن جھٹکے سے میز کی دراز کھولی اور اس میں سے وہی پستول نکال کر ڈاکٹر کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے بولا write he died of cholera otherwise you are also going to have cholera ڈاکٹر تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے فوراً اپنی میڈیکو لیگل رپورٹ میں لکھا "ہیضے کا موذی مرض ملزم کے لئے جان لیوا ثابت ہوا ہے۔"

کہتے ہیں کہ ایک ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو جب labour pains شروع ہوئے تو فوراً دائی کو بلوایا گیا۔ سردیوں کا موسم تھا، غضب کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اضطراب کے عالم میں باہر برآمدے میں چکر لگا رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ لان پر پڑی۔ اس نے چاند کی روشنی میں دیکھا کہ لان میں کوئی لاش پڑی ہے۔ گھبرا کر جب وہ نزدیک پہنچا تو مردہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ صاحب حیران ہو کر بولا "ارے! تحصیلدار صاحب اس سردی میں آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

اس پر تحصیلدار صاحب دست بستہ ہو کر بولے "حضور! بیگم صاحبہ تکلیف میں ہوں تو یہ خاکسار آرام کیسے کر سکتا ہے۔" دروغ بر گردنِ راوی، وہ تحصیلدار ملک خدابخش بچہ تھے۔

ایک ڈپٹی کمشنر کی شادی ہوئی تو دفتر کے اسسٹنٹ نے اسے مبارکباد کا تار بھیجا۔ لائق ماتحت نے لکھا Heartiest congratulations over your marriage. May God grant you son at his earliest convenience.- قدرت اللہ شہاب نے ڈپٹی کمشنر کی ڈائری میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کا ذکر کیا ہے جو انگلستان سے شادی کر کے واپس ہندوستان آیا تو

ڈسٹرکٹ ناظر نے باقاعدہ جشن کا اعلان کیا- ڈنر اور موسیقی کا اہتمام کیا گیا- رات کو جب وہ اپنی خواب گاہ میں پہنچا تو ناظر صاحب چھت کے روشن دان سے چپک کر 'بلیو' فلم بنفس نفیس دیکھ رہے تھے- فلم کے شروع ہوتے ہی انہوں نے باہر کھڑے ہوئے بینڈ کو اشارہ کیا اور بینڈ نے انگلستان کا قومی ترانہ بجا دیا- شہاب صاحب یہ لکھنا بھول گئے یا شاید انہوں نے مناسب نہ سمجھا کہ ترانے کے بول یہ تھے- ''God, save the Queen''

شہاب نامے کا مطالعہ کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ڈپٹی کمشنر کی ڈائری کو انہوں نے مزے لے لے کر چٹخارہ دار زبان میں لکھا ہے- اس میں اللہ دین کے چراغی جن کی طرح اس ناظر کا ذکر ہے جو ڈی سی کا ہر حکم ہر وقت بجا لانے کے لئے کمر بستہ رہتا ہے- سفید براق لباس پہنے اور سروں پر مرغان کلنگ سجائے دست بستہ موؤب بیروں کا تذکرہ ہے اور ان زمینداروں کے قصے ہیں جو ساری رات اس گھبراہٹ میں سو نہیں سکتے مبادا صاحب نے ان کی بھیجی ہوئی ڈالیاں لوٹا دی ہوں- شہاب صاحب جھنگ میں قریباً ایک سال ڈپٹی کمشنر رہے- شاید مزید عرصہ بھی گزارتے لیکن غلام محمد گورنر جنرل کی نگہ انتخاب ان پر پڑ گئی اور اس نے انہیں اپنے پاس کراچی بلا لیا- اس کار خیر میں نیک نیتی سے زیادہ اس کے خبث باطن کا عمل دخل تھا- اس نے کوئی سفارش کی جو شہاب صاحب پوری نہ کر سکے- فنانس کا آدمی تھا حساب کتاب برابر کرنا جانتا تھا- غالباً یہی بتانے کے لئے اس نے انہیں اپنے قریب کر لیا- وہاں ان کے شب و روز کیسے کٹے؟ اس کا جزوی ذکر انہوں نے اپنی کتاب میں کر دیا ہے-

شہاب صاحب نے جو باتیں لکھی ہیں ہو سکتا ہے ان کے زمانے میں ایسا ہی ہوتا ہوگا لیکن آج اگر وہ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا ہے بلکہ اب صرف پانی گزر رہا ہے پل باقی نہیں بچا- ڈپٹی کمشنری بقول شخصے ''سریر امارت سے نکل کر حصیر ملازمت'' میں آ گئی ہے- دن بدن ڈی سی کے اختیارات گھٹ رہے ہیں- جوڈیشل پاورز عملاً ہائی کورٹ نے واپس لے لی ہیں- ترقیاتی کام ضلع کونسلوں نے سنبھال لیا ہے- مالیہ عوامی نمائندوں کی وجہ سے موصول نہیں ہو پاتا- کنگ جان نے ۱۲۱۵ میں میگنا کارٹا کے وقت کہا تھا **Why don't the Barons, with these unjust exactions ask my kingdom?**- آج اگر کنگ جان زندہ ہوتا اور اس کنگ نیم جان کو دیکھتا تو شاید اپنی کم مائیگی پر یوں کف افسوس نہ ملتا-

کہاں ناز و نخوت، جاہ و حشمت کا جہان چار سو
کہاں سوز و ساز درد و داغ و جستجو و آرزو

بایں ہمہ عوامی توقعات وہی ہیں۔ حکومت بھی بغیر فنڈز دیئے بہت کچھ ہوتے دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر ضلع میں سیلاب آ جائے اور دریا کا بند ٹوٹ جائے تو عوام کا ایک ہی مطالبہ ہوتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کو اُلٹا لٹکا دیا جائے۔ محکمہ نہر کو کوئی نہیں پوچھتا جن کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ بندوں کو مضبوط کریں۔ ریلیف کیمپوں میں یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ فنڈز کہاں سے نہیں آئے ہیں۔ ہر کوئی یہی شکایت کرتا ہے کہ ڈی سی نے کچھ نہیں دیا۔ کچھ نہیں کیا۔ حکومت اپنے جلسے جلوسوں میں لاکھوں لوگوں کی شرکت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسے اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ اتنے لوگ کیسے جمع ہوں گے اور ان کو لانے لے جانے پر اُٹھنے والے اخراجات کون پورے کرے گا۔ بالفرض طوعاً وکرہاً ضلعی انتظامیہ مجمع اکٹھا کر بھی لیتی ہے تو لیڈر صاحب یہی کہیں اور سمجھیں گے کہ ان کی مقناطیسی شخصیت عوام کو کشاں کشاں جلسہ گاہ تک لے آئی ہے۔ الیکشن میں جس جھرلو کا ذکر شہاب صاحب نے کیا ہے وہ طریق کار اب بہت پرانا اور دقیانوسی ہو چکا ہے۔ یہ الیکٹرانک ایج ہے۔ جو کام کمپیوٹر کا ایک بٹن دبانے سے ہو سکتا ہے اس کے لئے اس قدر اُچھل کود اور بیلٹ بکسوں کی اُلٹ پلٹ کی کیا ضرورت ہے؟

ڈپٹی کمشنروں کی اکثریت آئی سی ایس افسروں پر مشتمل تھی۔ اس کے لئے باقاعدہ مقابلے کا امتحان ہوتا تھا۔ عام لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ انگلستان سے نائی، موچی، دھوبی اور چھابڑی فروش آ جاتے ہیں اور یہاں آ کر افسری کرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہ تھا۔ نہایت قابل، دیانت دار اور دُور اندیش افسر بھرتی کئے جاتے جن کا واحد مطمع نظر سلطنت کا استحکام تھا۔ اس کے لئے میکاؤلی کی تعلیمات کے مطابق وہ ہر کام کرنے اور ہر قدم اُٹھانے پر ذہنی طور پر تیار رہتے۔ اخلاقیات، راستی، رحم دلی، کوئی قدر بھی ان کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکتی تھی۔ ان کا ماٹو Ends Justify means تھا۔ البتہ عام زندگی میں وہ انصاف کرتے۔ رعایا کا خیال رکھتے، رشوت سے حتی الوسع اجتناب برتتے، سخت محنت کے عادی اور دیگر سامراجی طاقتوں کے برعکس رعایا کے مال کو جاگیر پدر نہ سمجھتے۔ بشریت کے تقاضوں کے باوصف عام طور پر عورتوں پر بھی ڈورے نہ ڈالتے بلکہ اکثریت اپنی ٹوٹی پھوٹی میم پر ہی اکتفا کرتی۔ دیار غیر، نامساعد حالات، اجنبی لوگ، انوکھی زبانیں، ناموافق موسم، اس قدر شدید گرمی کہ جسم کی چربی بھی پگھلتی ہوئی محسوس ہوتی۔ حشرات الارض۔ کہاں لندن کی صاف ستھری سڑکیں اور کہاں گرد و غبار میں اٹے ہوئے ناہموار راستے۔ انڈین سول سروس میں صرف Committed لوگ ہی آتے تھے۔ یہ کمپنی کے افسروں کی طرح چند

سال کا 'شکار' نہ تھا بلکہ ساری عمر اور جوانی کو تج دینے کا نام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے دن رات محنت کی۔ طوائف الملوکی کو ختم کرنے کا کریڈٹ لیا۔ مذہبی منافرت کا قلع قمع کیا۔ حصول انصاف کو سستا، صاف، سہل اور یقینی بنایا۔ چادر اور چار دیواری کا تحفظ کیا۔ مواصلات کا نظام درست کیا۔ سڑکوں، ریل اور پلوں کے جال بچھائے۔ آبپاشی کے نظام کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ ریگزاروں کو گلزاروں میں بدل دیا۔

انڈین سول سروس میں اکا دکا ہندوستانیوں کو بھی شامل کیا گیا۔ ان کی ٹریننگ اور ذہنی ساخت بدلنے پر کافی محنت کی جاتی۔ اس بات پر خصوصی توجہ دی جاتی کہ ہندوستانی ہونے کے باوصف افسر اپنے آپ کو ذہنی طور پر اہل وطن سے الگ تھلگ سمجھے۔ افضل گردانے، اپنے ہندوستانی ہونے پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرے۔ انگریزی زبان بولنے پر فخر محسوس کرے۔ مادری زبان کو دقیانوسی سمجھے۔ اگر بولے بھی تو توڑ پھوڑ کر۔ آتا ہے، جاتا ہے۔ اس سارے عمل کو **Deindianization** کہا جاتا تھا۔

اس میں افسر کو اپنے ماضی کو دفن کرنا پڑتا تھا۔ ایاز کی گودڑی کی طرح سنبھال کر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ وہ ایک دم، اچانک اپنے معاشرے اور ماحول سے کٹ کر الگ تھلگ ہو جاتا۔ کہتے ہیں کہ عزیز احمد سابق فارن سیکرٹری کے بھائی ڈبلیو زیڈ احمد نے عید کے دن مسلمانوں کا مجمع دیکھا تو حیران ہو کر پوچھنے لگا۔ یہ لوگ کون ہے اور کدھر کو جاتا ہے؟ جب اسے بتایا گیا کہ یہ مسلمان ہیں اور نماز عید کے لئے جا رہے ہیں تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ''ویل تم مسلم لوگ گڑجا کرنا مانگتا'' (تم مسلمان لوگ اپنے گرجے کی طرف جا رہے ہو)

اس ذہنی ساخت اور ماہیت قلب کے باوصف یہ لوگ بھی محنتی اور کافی حد تک ایماندار تھے۔ سخت محنت کی بھٹی میں تپا کر انہیں تیار کیا جاتا تھا۔ آئی سی ایس کا پہلا امتحان لندن میں ۱۸۵۵ میں ہوا۔ نو سال بعد پہلا ہندوستانی کامیاب ہوا۔ آنے والی پانچ دہائیوں میں جتنے ہندوستانی بھرتی ہوئے ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان کتنا ہی زرخیز دماغ کیوں نہ رکھتا ہو، ہندو کی طرح محنت نہیں کرتا۔ ہندو صحیح معنوں میں کتابی کیڑے تھے۔ انگریزی زبان بھی انہوں نے بہت پہلے سیکھنی شروع کی۔ اس سلسلے میں انگریزوں نے بھی ان کی بہت مدد اور حوصلہ افزائی کی۔ چونکہ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اس لئے وہ ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ ہندو ان کے قدرتی حلیف تھے اور مسلمان ذہنی طور پر اپنے آپ کو پدرم سلطان بود کے چکر سے آزاد نہ کر پائے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی

کے اختتام تک پچاس ہزار سے زائد ہندو گریجویٹ تھے جبکہ مسلمانوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔

مسلمانوں کی اس زبوں حالی کو سرسید احمد خان نے پہلی دفعہ محسوس کیا اور انہوں نے علی گڑھ سکول کی بنیاد رکھی۔ انہیں احساس ہوا کہ جب تک مسلمان انگریزی نہیں سیکھتے وہ ترقی کے مدارج اور منازل طے نہیں کر سکتے۔ ہندوؤں نے تو اُن کی مخالفت کرنی ہی تھی لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ کچھ مسلم زعما نے بھی ان کا تمسخر اُڑایا۔ ان پر طرح طرح کی پھبتیاں کسی گئیں لیکن اس مردِ حق کے پائے استقامت کو متزلزل نہ کر سکے۔ جب نیت صاف ہو اور عزم صمیم تو پھر کوئی رکاوٹ بھی زیادہ دیر تک راستہ نہیں روک سکتی۔

دوسری جنگ عظیم نے ایک بات روز روشن کی طرح عیاں کر دی کہ انگریز زیادہ دیر تک ہندوستان میں نہیں ٹھہر سکتا۔ آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو ہندو مسلم اکٹھے تھے۔ علامہ اقبال نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا ہندی ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ نیا شوالہ میں برہمن کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

پتھر کی مورتی میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

لیکن یہ خوش فہمی اور یگانگت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ جلد ہی مسلمانوں کو احساس ہو گیا کہ ان کا پالا دو شیطانوں سے پڑ گیا ہے۔ ایک وہ جو اپنی ایمپائر کے ڈوبتے ہوئے سورج کو بڑی حیرت اور حسرت سے تک رہا ہے اور دوسرا وہ جو صدیوں کی غلامی کا حساب چکانے کے لئے منہری سازشوں کے جال بن رہا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں نے لاہور ریزولیشن کی صورت میں ۱۹۴۰ء میں الگ ملک کا مطالبہ کر دیا۔ علامہ اقبال نے بھی اپنی سوچ کے قافلے الگ راہوں پر ڈال دیے۔ نیا شوالہ کا شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

.....

ہندوازم اور اسلام ریل کی ان دو پٹریوں کی طرح ہیں جن کا کہیں ملاپ نہیں ہوتا۔ ان کی عبادات الگ ہیں۔ کلچر مختلف ہے اور تاریخ کے راستے بھی جدا ہیں۔ وہ بُتوں کی پوجا کرتے ہیں تو ہم خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں۔ بھگت گیتا کا اشلوک کوئی شودر نہیں سن سکتا اور یہاں مسجد کے میناروں سے پانچ وقت اذان ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے مسلمانوں کی لیڈر شپ محمد علی جناح کے قابل ہاتھوں میں آئی۔ جس کے ایک مطالبہ نے مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا۔ کسی نے اسے دیوانے کا خواب کہا تو کوئی اسے مجذوب کی بڑ قرار دینے لگا۔

غیر تو غیر اپنے بھی کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کی وجہ سے اس گروہ میں شریک ہو گئے جن میں

مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سرفہرست ہیں۔ مولانا مدنی کا تعلق دیوبند مکتب فکر سے تھا۔ وہ ایک جید عالم دین تھے۔ انہوں نے وطنیت پر ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا جواب علامہ نے چند شعروں میں دیا۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیو

ایک اور موقع پر اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا:

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست

....

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد بھی بہت بڑے عالم تھے لیکن قائداعظم انہیں سیاسی نابالغ کہتے تھے اور اکثر Show boy of Congress کی پھبتی کستے۔

مسلمانوں کی جدوجہد بالآخر رنگ لائی۔ کوئی سازش، لالچ اور فریب بھی قائداعظم کی "حکمت عملی" کے آگے نہ ٹھہر سکا۔ ساری مسلم اُمت ان کے پیچھے یک جان اور یک زبان ہو کر کھڑی ہو گئی۔ پٹیل اور نہرو نے بھی یہ کہہ کر جان چھڑا لی کہ If they want to go to hell, let them go to hell. وہ مہاتما گاندھی جو بڑی شدومد کے ساتھ کہتا تھا Partition of Inida over my dead body اس نے مولانا آزاد کے مطابق بتایا کہ جواہر لعل نے اسے قائل کر لیا ہے کہ تقسیم کا عمل ناگزیر ہے۔

یہ ملک تو آزاد ہو گیا لیکن فکر و نظر آزاد نہ ہو سکے۔ غلامانہ ذہنیت برقرار رہی۔ بدقسمتی سے بابائے قوم جلد رحلت فرما گئے اور ہر کوئی ہرچہ باداباد کے مصداق اپنی اپنی کشتی پر سوار ہو گیا۔ انڈین سول سروس تو ختم ہو گئی لیکن اس کی کوکھ سے ایک ایسی سروس نے جنم لیا جس کی خو بو اور طمطراق تو انگریز افسروں جیسا تھا لیکن قابلیت اور کردار اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ اس کا نام سول سروس آف پاکستان رکھا گیا۔ کوٹہ سسٹم کی وجہ سے سب گدھے گھوڑے ایک ہی طویلے میں آ گئے۔ پلاٹو کے فلاسفر کنگ کی طرح انہوں نے اپنے آپ کو ہر مرض کی دوا سمجھ لیا۔ Jack of all trades اپنے آپ کو ہر شعبے کا ماسٹر سمجھنے لگے۔ Reason personified ضلعی انتظامیہ تو ان کے ہاتھ میں تھی ہی۔ کوئی دوسری سروس بھی ان کی دستبرد سے نہ بچ سکی۔ محکمہ صحت، زراعت، لوکل گورنمنٹ، فنانس، تعلیم، ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن، خوراک، صنعت، انہار، محنت، جنگلات، لائیو سٹاک الغرض سب کے سربراہ اس سروس سے منتخب ہونے لگے۔ ہوم سیکرٹری کی صورت میں پولیس کو بھی اپنے زرو شکنجے میں جکڑ لیا۔ پولیس

افسروں کی ترقیاں اور تبادلے محکمہ S&GAD کرنے لگا۔ پیرتسمہ پا کی طرح اس کے افسر قوم کے اعصاب پر مسلط ہو گئے۔ اپنا تسلط اور اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ قومی زبان کو طاق نسیاں میں رکھ دیا جائے۔ اس کی جس قدر تذلیل ہو سکے کی جائے۔ ایک طویل عرصہ تک پڑھا لکھا شخص صرف اسے گردانا گیا جو اپنی قومی زبان سے نابلد اور ناآشنا ہو اور جو تمباکو کے پائپ کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے دریائے ٹیمز میں ڈھلی ہوئی انگریزی بولتا ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انگریزی کا ایک لفظ غلط بولنے پر آپ کو ساری زندگی معاف نہیں کریں گے۔ تمسخر اڑائیں گے لیکن خود آٹا ہے، جاتا ہے، کہہ کر اپنی علمیت کے جھنڈے گاڑیں گے۔ دنیا کے کئی ممالک میں انگریزی بولی جاتی ہے۔ ہر ملک کے شہری اپنے مخصوص لب و لہجے میں یہ زبان بولتے ہیں۔ یہ واحد ملک ہے جہاں آکسونین لہجے میں بات کرنے کی بھونڈی کوشش کی جاتی ہے۔

کسی تجربہ کار افسر نے کیا خوب بات کہی تھی۔ پہلے ڈپٹی کمشنر کو دیکھ کر وحشت طاری ہوتی تھی اب کچھ اور جذبے سر اُٹھاتے ہیں۔

ریونیو سسٹم سے اکثر افسر نابلد رہتے ہیں۔ خسرہ گرداوری کو خسرا گرداوری بولتے ہیں۔ پٹواری کے میلے کچیلے گندے بستے کو ہاتھ تک لگانا گوارا نہیں کرتے۔ ضابطہ کی رُو سے ضروری ہے کہ مہینے میں فیلڈ افسر بارہ راتیں باہر گزارے۔ ان کے نزدیک شب باشی کا مفہوم ہی کچھ الگ ہے۔ ان کی چال ڈھال، رہن سہن اور لب و لہجے سے گمان ہی نہیں ہوتا کہ یہ اس ملک کے شہری ہیں۔ عوام کے ساتھ ان کا رویہ نہایت تضحیک آمیز، معاندانہ اور ناروا ہوتا ہے۔ دوسرے محکمے کے افسروں کو بھی گھاس نہیں ڈالتے۔ یہ دنیا کی واحد سروس ہے جو خودکوزہ و خودگوزہ گرو خودگل کوزہ کے مصداق Self appointed, self promoted & Self exalted ہے۔ انہیں اکیڈمی میں جس قسم کی تربیت دی جاتی ہے ایسی تو انگریز افسروں کو بھی نہیں دی جاتی تھی۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ جب بھی کوئی ملنے آئے تو نہایت دھیمے لہجے میں مبہم بات کرو تاکہ وہ Beg your pardon - Beg your pardon کہتا رہے۔ کبھی اپنے پاس Pen نہ رکھو ہمیشہ دوسرے کا قلم استعمال کرو۔ وہ قلم کھول کر آپ کو دونوں ہاتھوں سے پیش کرے گا اور واپسی پر نہایت ادب اور احترام کے ساتھ اسے بند کرنا پڑے گا۔ اگر اپنا کام ہو تو بچھ جاؤ۔ جب دوسرا کچھ کہے تو فوراً آنکھیں ماتھے پر رکھ لو۔

[جاری ہے۔]

یہ کہاں نصیب میرے..... [آخری قسط]

روضے کی سبز جالی کے گرد لگے چار جانب مضبوط راڈ کی رکاوٹیں دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔

کہ میں روضے کی جالی سے سر ٹکا کر اپنے دل کی باتیں کیسے کروں گی۔ کیسے کہوں گی یارسولؐ اللہ آپ کی غلام حاضر ہے۔ کیسے اپنے دکھڑے پھولوں گی۔ کہونگی کہ روز حشر میرے سب گناہوں کی معافی کے لیے سفارش فرمائیے گا۔

جب تک آپ کسی کے گلے نہ لگیں لمس کا احساس پورا نہیں ہوتا۔ میں روضے کی جالی سے لپٹ جانے کو بے قرار تھی۔

مگر کیا کیا جائے کہ وہاں بھی کھڑی سخت گیر وارڈن پولیس گارڈ خواتین آپ کو ایک حد سے آگے بڑھنے کہاں دے رہی تھیں۔ ڈنڈے مارنے تک آتی تھیں۔ انھیں کیا خبر کہ اس وفور شوق کا عالم کیا ہے۔ اس تڑپ اس کرب کی آرزو میں دم کیسے نکلتا جاتا ہے۔

اس رش میں میں نے بھی اپنی پوری جسمانی طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے خود کو کم از کم ان سٹیل کی راڈ کی کھڑی کی گئی رکاوٹوں تک پہنچا لیا جہاں سے روضہ اقدس فقط چار قدم پر تھا اور وہاں مرے ایک ہاتھ نے گرفت پکڑ لی وہ شُرتی عورتیں ذرا آنکھ ہٹاتیں تو اچک کر ایکبار تو میں روضے کی جالی کو چھو ہی لیتی۔ مگر وہ عورتیں جو روضے کی حفاظت پر مامور تھیں ان کی آنکھیں بہت تیز اور شاطر تھیں۔ وہاں کھڑے کھڑے دعائیں کرتے کرتے، معافیاں مانگتے مانگتے، اظہارِ محبت کرتے کرتے، اپنے آقا و ملجا و ماویٰ کے حضور یکدم مجھے اپنی

رخشندہ نوید

ماں کی التجا یاد آئی۔
اس چادر کو روضہ رسول سے مس کر کے لانا۔ ماں کچھ کہے اور میں نہ کروں، وہ ماں جو حبِ رسول میں زندگی کی تمام دوسری آسائشیں اور خوشیاں قربان کر چکی تھی۔
میں نے اُس دراز سبز چادر کا ایک سرا ایک جانب بائیں جانب کے پلو سے دراز کیا اور اُسے اپنی پوری طاقت سے ہوا میں لہرایا، اُسے آسمانوں پر چھوڑ دیا کہ وہ ہوا کا ہاتھ تھامے اور روضے کی جالی کو چوم کر آئے۔
ایک رش کا ریلہ بضد تھا کہ میرے ایک ہاتھ کی پکڑ جو اُس پائپ پر مضبوط تھی اُسے کمزور کر دے تاکہ کوئی اور میری جگہ آ کر کھڑی ہو۔ مگر میں بھی رخشندہ نوید تھی۔ مری محبت کیا اپنے نبی کے لیے کچھ کم تھی۔ میں اُس سے کسی جن کی طرح ایک جنونی حالت وجد میں تھی۔ کس مائی کے لال کی طاقت تھی کہ مری سبز چادر کو روکے جو حضور کی جالی کو مس کیے بنا لوٹ نہیں سکتی تھی۔
مری تیسری کوشش کے بعد مری چادر سے روضے کی جالی کو اپنی آنکھوں سے چوما۔ باقاعدہ جالی کو ہاتھ لگایا اور میں نے اُس چادر کو چوم چوم کر اپنے تن کے گرد لپیٹ لیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ قرار آیا۔ مری تڑپتی روح گویا سکون میں آئی۔ اس مقصد میں کامیابی کے میں نے دیکھا کہ میں اس جگہ کے قریب دھکے کھاتی کھاتی پہنچ چکی ہوں جسے ریاض الجنہ کہتے ہیں جہاں سجدہ کرنے اور جگہ حاصل کرنے کے لیے تقریباً ناممکن حالات تھے کوئی بھی خاتون آپ کو ایک انچ بھی جگہ دینے کی حقدار نہیں تھی۔ خواتین بھی وہ جن کی زبان مختلف تھی۔ یوں بھی اتنا شور اور درود پاک کی اتنی گونج تھی کہ کوئی آواز نہ سنی جا سکتی تھی، نہ ہی سنائی جا سکتی تھی، مگر وہاں بھی میرے حضور نے میری دعا سنی اور میں نے اُس مقام پر۔ سجدہ کیا پورا سجدہ کیا۔ جو اتنی کم جگہ پر محیط تھی کہ بس پورا وجود ایک مٹھی بن گیا ماتھے کو ٹیکتے ہی گویا آپ نے کسی پہاڑ کی چوٹی کو سر کر لیا۔ معلوم نہیں میں کہاں تھی کب سے تھی روضے کی جالی کو اوڑھنی نے چوما ریاض الجنہ پر سجدہ ادا کیا۔ منہ میں ہزاروں بار درود پڑھا۔ رو رو کر التجائیں کیں۔ بس ابھی اتنا ہی وقت گزرا تھا اور بس ان کالے برقعے والیوں نے اعلان کر دیا کہ میں اور مرے ساتھ اندر آنے والے ریلے کے باہر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تھکے ہارے قدموں اور آخری دیدار کرتے ہوئے چار و ناچار میں انھیں دراز برآمدوں اور مسجد نبوی کے صحنوں سے گزرتی ہوئی باہر کی جانب لوٹ آئی۔ فون مرے پاس نہیں تھا بلکہ نوید

کے پاس تھا۔ میں واپسی پر باہر آ کر بھی راستہ بھول گئی۔ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے مسجد نبوی کے باہر کی جانب نکلی تو دور سے دیکھا میرے لواحقین کھڑے تھے۔ میں اپنی روح روضہ رسول کو سونپ کر لوٹی تھی۔

میں قریب گئی تو دیکھا نبیلہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وہ مجھ سے پہلے کب کی باہر آ چکی تھی۔ چونکہ وہ مجھے تلاش کرتے کرتے باہر لوٹی تو باہر آ کر پریشانی کے عالم میں رونے لگی کہ چھنڈی پھوپھو معلوم نہیں کہاں رہ گئیں۔ وہ مجھ سے بچھڑ گئیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ تمھارا قصور نہیں ہے۔ میں خود ہوا کے دوش پر تھی۔ میں نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ اُس کے چہرے کی فقط آنکھوں کے سوا تمام بدن سیاہ عبایا میں قید تھا۔ میں تو بڑے اعتماد سے بس اپنی ماں کی چادر کو سب کچھ بتائے اپنے داتا کی حضوری کر آئی تھی۔

نوید افضل سے میں نے پوچھا آپ نے روضہ کی جالی کو چھوا۔ مگر ادھر بھی حالات ہمارے جیسے ہی تھے لیکن نوید کی آنکھوں کی سرشاری وصل رسول کے خوش کن لمحات کی عکاس تھی۔ نوید نے بتایا کہ بڑا کرم ہوا ہے ہوا کچھ یوں کہ ہمارے تمام کاغذات، ویزہ، پاسپورٹ، جتنی بھی کرنسی ہمارے پاس تھی سب سے بڑھ کر فون بھی نوید نے کمر پر ایک چمڑے کے بیلٹ نما پرس میں محفوظ کر رکھے تھے اور دورانِ سفر کعبہ اور دوران سفر مسجد نبوی وہ اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھے ہوتے تھے۔ مری طرح مقام ریاض الجنہ پر سجدہ ریز ہوتے ہوئے دھکم پیل میں وہ بیلٹ کھل گئی۔ اور وہ تمام اہم ترین اشیا اندر ہی گر گئیں۔

روضہ اقدس کے جلال وجلوہ باعث جس طرح میں نبیلہ کو بھول گئی تھی اسی طرح نوید افضل بھی حسنین سے بچھڑ چکے تھے اور اکیلے ہی روضہ رسول کی زیارت فرما رہے تھے۔ وہ باہر آئے تو حسنین ان کو ڈھونڈ رہا تھا۔ کیونکہ مسجد نبوی کی انتظامیہ کی طرف سے حسنین کو فون پر فون آ رہے تھے۔ نوید افضل نے چونکہ آخری فون کال حسنین کے نمبر پر کی تھی۔ نوید کا والیٹ، فون اور اہم ترین سامان کسی اللہ کے بندے نے اٹھا کر مسجد نبوی کی انتظامیہ کے آفس کے سپرد کر دیا تھا جہاں اُن کی تمام اشیاء بشمول پاسپورٹ ویزہ اور کرنسی محفوظ تھے۔ اور انھیں واپس مل گئے تھے۔ یہ اتنا بڑا بلنڈر تھا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک شے بھی واپس نہ ملتی تو ہماری واپسی مشکوک ہو جاتی۔

روضہ رسول کے کشادہ برآمدوں اور صحن کی

فضا میں زندگی کے انمول چند گھنٹے گزارنے کے بعد نماز عشا کی ادائیگی کرتے ہوئے ہم گاڑی میں بیٹھے تو بدن جیسے پھول برابر تھے۔ ایک ہوٹل میں کھانے پینے کے لئے حسنین نے گاڑی روک دی۔ اُس کھانے کی میز پر میں نے اپنی پسند کی شادی کرنے والے اس جوڑے کو سلام کیا اور شادی کی سلامی دی۔ نبیلہ یعنی حسنین کی پسند کچھ اتنی بری نہیں تھی۔ لیکن شادی اگر سیدھے طریقے سے ہوتی تو اور بھی بہتر تھا۔ حسنین رات گئے ہمیں پاکستان ہاؤس چھوڑ گیا اپنے قافلے کے ساتھیوں میں اکا دکا واپس لوٹ کر ملاقات ہوئی ہم نے نصر اللہ صاحب کو اپنے واپس لوٹ آنے کی اطلاع کی۔ اگلی صبح ہمیں مشاعرے کے منتظمین کی جانب سے زیارات دکھانے کے لیے ایک اعلیٰ بس کا انتظام کیا گیا تھا جس پر ہم نے تمام اہم مساجد اور ان زیارتوں کی زیارت کرنا تھی جن کے بغیر مدینہ کی سیر نامکمل تھی۔

صبح ناشتے پر ہم نے ملتمس ہوتے ہوئے دوبارہ معذرت کی کہ یقیناً اس قافلے کے ساتھ بہترین پروٹوکول افسر کے فرائض انجام دینے والے نصر اللہ خان کی معاونت میں مساجد اور زیارات کا تجربہ یادگار ہوتا۔ مگر کیا کرتے کہ حسنین ظفر دوبارہ بضد تھا ایکبار پھر یہ شرف وہی حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہمیں اپنی گاڑی میں تمام زیارات پر لے جانے کا شوق پورا کرنا چاہتا ہے۔ سو ہم تقریباً سب کو ناراض کرتے ہوئے دوبارہ حسنین کی گاڑی میں عازم سفر ہوئے سب ہمیں بگھوڑا بگھوڑا کہہ رہے تھے مگر بخوشی سب نے اجازت دے دی اور ایک بار پھر مسجد نبوی میں ظہر کی نماز نصیب ہوئی اور ایک بار پھر روضے کی جالی کے دیدار کا موقع بنا۔ آقا نے ایک بار پھر در محمدؐ پر سجدہ ریز ہونے کی اجازت دی۔ کہاں میں ماڈریٹ مذہبی، نماز بھی بس ایک ٹکر مارتے ہوئے ادا کرنے والی، نماز میں بسا اوقات ذہن اور دھیان دنیاوی معاملات کے تانوں بانوں میں الجھا ہوا۔ مگر اس حضوری و حاضری نے ثابت کیا کہ میرا اپنے آقا سے دلی، قلبی، ذہنی، روحانی، رشتہ نہایت جڑیں پکڑتا ہوا مری روح کے خانوں میں روشنی بھرتا ہوا ہے۔ اسی لیے دوسری بار پھر ہم نے روضے کی جالی تک پہنچے اور اس کی خوشبو سے خود کو مہکایا اس بار میں نبیلہ کے ساتھ رہی وہ مجھے مسجد نبوی میں موجود لاکھوں کی تعداد میں الماریوں میں سجے قرآن کے دیدہ زیب نسخے دکھاتی رہی۔ وہ اور حسنین مسجد نبوی کے چپے چپے سے واقف ہیں۔

اُس روز سیر ہو کر آب زم زم پینے اور اپنے

پورے سر اور بدن پر اس پانی کے چھڑکاؤ کے بعد ہم زیارتوں کے سفر پر نکلے۔
جس میں نہایت شاندار مساجدِ شامل تھی جہاں ہم نے نماز عصر اور نماز مغرب ادا کی۔
حسنین کے ساتھ مدینہ کے گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے اپنی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ گاڑی مسجد قبلتین کی جانب رواں تھی ظہر کا وقت تھا۔ ہماری طرح بہت سے اور بھی نمازی گاڑیاں روکے جماعت کے ساتھ نماز لینے کی سعی میں تھے۔ میں قبلہ رخ کھڑی سوچ رہی تھی کہ وہ کیا منظر ہو گا جب مرے نبی اکرم نے دوران نماز نمازیوں کو اپنی سمت یعنی قبلہ رخ ہو جانے کا حکم فرمایا ہوگا حسنین نے فقط ایک مسجد ہی نہیں اس نے ہمیں (مساجد السبعۃ) یعنی سات مساجد کے دیدار کروائے میں نے اپنی ماں کی طرح بہت سے نوافل ادا کیے۔
حضور جہاں جہاں قدم رنجہ فرما چکے تھے ان جگہوں پر قدم رکھتے ہوئے میں ۱۴۰۰ سو سال پہلے کے زمانوں میں پہنچ چکی تھی۔
مسجد قبا دیکھ کر حضور کی محبت میں آنکھیں بھر آئیں۔ جب مٹی اور گارے سے خود مرے آقاؐ نے بنیاد رکھی اور خود اس میں اپنے ہاتھوں سے پہلی اینٹ بھری۔ اب یہ مسجد جدید فن تعمیر کے نمونہ ہے اور اکیسویں صدی کے تعمیری معیار کے عین مطابق ہے۔ حضرت ایوب انصاری کے گھر کے گرد جنگلے لگے تھے اور وہ اپنی اصل حالت تو نہیں بلکہ اس کی کچھ مرمت کرتے رہنے کے باعث وہ محفوظ ہے میں اس مقام کو دیکھ بہت جذباتی ہوئی۔ ہم لوگ تو اپنی حضور کے لئے اس محبت کے ایک قطرہ کو دل میں بسائے اس پر نازاں ہیں مگر وہ صحابی جوان پر اپنی جان و مال اور دولت گھر سب نچھاور کر دیتے تھے۔ حسنین نے ہمیں مقام سنیہ الوداع کے بھی دکھایا۔ مرے کانوں میں ان بچیوں کے ہاتھوں میں تھامی دف کی آواز گونجی جب حضور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے مدینہ ہجرت فرما چکے تھے۔ مدینہ میں ان کا استقبال اسی مقام پر کیا گیا تھا۔ میں مسلسل حیرت میں تھی اور اسلامک ہسٹری کو از سر نو پڑھنے کا خود سے عہد دہرا رہی تھی۔ مساجد کے بعد حسنین ہمیں احد شریف کے مقام پر لے گیا۔ اس غار میں جہاں حضور نے دندان مبارک کے شہید ہونے پر پڑاو کیا، اس غار میں آج بھی الوہی خوشبو کے جھونکے بسے ہوئے ہیں۔ میں نے اس پر یقین کرنے اور اسے محسوس کرنے کی غرض سے بار بار باہر اندر جا کر دیکھا مگر ہر بار پہلے سے زیادہ خوشبو نے معطر کیا۔ غار سجادہ دیکھی اور پھر وہ مقام کہ جہاں پاک روحیں ابدی نیند سو رہی

ہیں یہ وہ مبارک مقام جسے جنت البقیع کہتے ہیں- لاتعداد عاشقانِ رسول کی قبور پر فاتحہ پڑھی- اس قبرستان کے گرد بھی ایک تاروار جالی کی دیوار کھڑی تھی- ایک بار میں نے سوچا کہ مدینے میں دفن ہو جانے کی دعا مانگوں- مگر اپنے بچوں کا سوچ کر میں ایسا کر نہ پائی- یوں بھی بہ حکمِ خدا اگر وہاں موت لکھی ہوتی تو میں کون تھی؟ وہی مشت خاک، وہیں رہ جاتی-

ہم اس کنویں کے میٹھے پانی سے اپنا گلا تر کرنے بھی گئے جہاں سے حضور نے ایک بار پانی پیا تھا- وہ نایاب اور قیمتی باغات بھی ہم نے دیکھے جہاں عجوہ اور مشہور کھجور مبرد م اگتی اور بیچنے کے لئے پیک کی جاتی- وہی کھجور لاہور میں دو ہزار روپے کلو میں بکتی جاتی ہے جو وہاں سے ہمیں نہائت کم قیمت پر ملی- ہم نے بہت سی کھجوریں نہ صرف کھائیں بلکہ بہت خریداری بھی کی- اور آخر میں حسنین نے کہا کہ چلیں آپ کو وادی جن لئے چلتے ہیں وہاں گاڑی بغیر کسی ڈرائیور پیچھے کی جانب از خود چلنا شروع کر دیتی ہے نہ صرف کار بلکہ بوتل یا کچھ بھی ایک مخصوص دائرہ زمیں میں رکھا جائے- تو بنا ڈھلوان کے وہ پیچھے کی جانب چلنا شروع ہو جائے گی- اکثر لوگ وہاں بار بار چیزیں رکھ کر یقین کرنے کی غرض سے تجربے کر کے دیکھ رہے تھے- ہم گاڑی سے اتر گئے اور حسنین نے اپنی کار کے ساتھ بھی وہی تماشہ کر کے دکھایا- جس پر سائنس جانے کیا نقطہ نگاہ پیش کرے ہمیں تو وہ کوئی جادوئی کرشمہ لگا جس کی تہہ تک شائد ابھی کوئی نہیں پہنچ پایا اسے وادی البیھا بھی کہتے ہیں اسے دیکھنے کے لئے ہمیں لمبی ڈرائیو کرنی پڑی- اس کے بعد ڈنر باہر ہی کرتے ہوئے ہم نے شہر مدینہ کے گرد و پیش میں جا بجا دکھائی دیتے بازاروں میں رک کر دیکھا- بڑی ایک مسجد کے باہر قریبی کشادہ سڑک پر جہاں ٹریفک نہیں تھی- بہت سی غریب عورتیں سوڈانی، افریقی، سڑک پر سٹال لگا کر مختلف اشیاء بیچ رہی تھیں- مدینہ سے وہی روایتی شاپنگ ہم نے بھی کی جو اکثر حج عمرہ سے لوٹنے والے ہمارے گھروں میں دے کر جاتے ہیں- جاء نماز، تسبیح، کھجوریں-

اگلی صبح ہماری مدینہ سے ہی پاکستان کو واپسی تھی ان گنتی کے دو چار دنوں میں ہم سات افلاک کی سیر کر آئے تھے ناممکن کو ممکن بناتے ہوئے-

میں نے لاہور آ کر سب سے پہلا کام یہی کیا کہ ماں کے سر پر وہ چادر ڈال دی جسے میں روضے کی جالی کے لمس کی خوشبو بسی تھی-

☆☆☆☆☆

ہائے ربا وے ساہنوں ٹرنا پیا.....

محلّہ آجڑیاں عقب پرانا سول ہسپتال

صوفیہ بیدار

یہ میرا ننھیالی محلّہ تھا اسے محلّہ آجڑیاں'' بھی کہتے تھے یعنی ''ایجڑ'' رکھنے والے جانوروں کے مالک۔ اس زمانے کے لحاظ سے مال دار لوگ..... ڈھور ڈنگر رکھتے پکے برتن بھانڈے، پیتل، تانبہ، کہی کے تھال، سینیاں، بادیہ چھنے، گڑویاں، دیگچیاں بڑی عزت و احترام سے پڑچھتی پر دھرے ہوتے..... چھوٹی چھوٹی ''کُجیاں'' جن میں عورتیں کمیٹی کی رقم اور گھر کی بچت چھپا چھپا کر سینتتی۔ استعمال کے پکے برتن ڈولی میں دھو مانجھ کر رکھے جاتے چونکہ سالن کی روزانہ پڑوسیوں سے آمد و رفت ہوتی اس لیے احتیاطاً برتنوں پر گھر کے بڑے کا نام کھدا ہوتا ہمارے اکثر بادیہ چھنوں اور ڈولی کرمنڈل پر غلام قادر ہاشمی کا نام کُھدا ہوتا میرے نانا جو انگریزوں کے زمانے کے پولیس ڈپٹی یعنی ڈی ایس پی تھے اُن کے بڑے بھائی صاحب بہادر غلام حیدر نہ صرف ایس پی کے عہدے پر پہنچے بلکہ صاحب بہادر کا خطاب مع زمینوں ملا..... نانا چونکہ خودسر اور من مرضی والے تھے لہٰذا انگریزوں کی خوشامد نہیں کر سکتے تھے حتیٰ کہ جی حضوری بھی اُن کی فطرت میں نہ تھی

پولیس میں بھرتی ہو گئے تھے کہ اُس زمانے میں انگریز رنگ ونسل کے بہت قائل تھے اور ایسے محکموں میں خاندانی النسل لوگوں کو شجرہ نسب دیکھ کر بھرتی کرتے تھے والدہ تاعمر اپنے شجرہ نسب کا حوالہ دیتی رہیں جو سیالکوٹ قلعہ پر پڑا تھا۔ والدہ وہ پہلی شخصیت تھیں جنھوں نے خاندانی روایت کے برخلاف اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

کہتے ہیں تایا غلام حیدر کے بیٹے عبدالواحد قریشی جو امی کے بہنوئی بھی تھے جب امی کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش سے واقف ہوئے تو نئے جوتے کپڑے روک دیئے جو وہ اکثر دلواتے بلکہ تمام خاندان کی پردہ دار خواتین کے لیے شیفون کے تھان لٹھے اور چھینٹ الگ الگ تھان برابر تقسیم کرتے تب سب کے پاؤں کا ناپ یا ماپ کاغذ پر پنسل سے لیا جاتا اور سب کی جوتیاں گھر ہی پہنچ جاتیں تایا غلام حیدر صاحب بہادر کے گھر کی خوشحالی اور اُن کی بہو ہماری خالہ شوکت کی چھوٹے بہن بھائیوں سے شفقت میں قدرے احساس برتری کا رنگ موجود رہتا۔ پچھلے لوگ اپنوں کی مدد کو شاید اس رنگ میں نہیں دیکھتے تھے لیکن ہماری تعلیم اور ہمارا شعور ہمیں اس نہج پر لے آتا ہے کہ آدھا غرور دینے والے ہاتھ میں آدھا لینے والے کے ذہن میں پہلے ہی سے رقم ہوتا ہے۔ والدہ نصرت ہاشمی پرانی چپل اور گھر کے کپڑوں میں اُس زمانے کی لیڈنگ سکول لیڈی اینڈرسن گورنمنٹ گرلز ہائی سکول داخلہ کے لیے پہنچ گئیں جو معروف آسٹریلوی ایجوکشنسٹ مس ینگ کے زیر اہتمام چل رہا تھا بڑی مشہور اور سخت ٹیچر مشہور تھیں۔ امی اُسی حلیہ میں اُن کے پاس پیش ہو گئیں اور تعلیم کی خواہش اور خاندانی مخالفت کا اظہار کیا مس ینگ جو برصغیر میں 17 برس کی عمر میں آ گئی تھیں۔ اور اردو پنجابی انگریزی کا کلچر تھیں والدہ کی آنکھوں کی چمک میں کچھ دیکھ کر راضی ہو گئیں کتابیں یونیفارم فیس سب دلوایا اور جواب میں عمدہ رزلٹ کی شرط رکھی۔ والدہ جیسٹ سپیکر عمدہ شاعرہ، اعلیٰ انگریزی دان مضمون نگار اور بہترین کھلاڑی ثابت ہوئیں۔ مس ینگ نے خوش ہو کر والدہ کو انعام دینا چاہا تو امی نے کہا انعام مجھے میری مرضی کا ملنا چاہیے استفسار پر والدہ نے کہا کہ میرے چھوٹے بھائی خان محمد ہاشمی کو کلاس میں سب سے پیچھے کی نشست پر بیٹھنے دیا کریں لڑکیوں کے اس سکول میں غیر معمولی استاد نے غیر معمولی شاگرد کی بات مان کر ماموں خان کو کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دیدی دونوں بہن بھائیوں کا انگریزی لٹریچر میں رجحان دیدنی تھا۔۔۔۔۔۔امی تو ”مرے“ کالج میں مسٹر مارٹ اور خالد حسن کی شاگرد ہوئیں ماموں کو ایف

اسے کرتے ہی خاندانی روایت کے مطابق پولیس میں سب انسپکٹر بھرتی ہونا پڑا......

ماموں کی شخصیت میں امی نے کیٹس، شیلے، اور کولرج کو گھول رکھا تھا ماموں تمام زندگی پولیس جیسی نوکری سے ایڈجسٹ نہ کر سکے......

امی لڑکیوں میں بیسٹ ڈیٹر تھیں تو والد عبداللہ ادیب یعنی ع - ادیب لڑکوں میں بیسٹ ڈیبٹر تھے ان دونوں کے سینئر ساتھی انگریزی ادب کا جانا پہچانا نام خالد حسن بعد ازاں دونوں کا پروفیسر ٹھہرا مثالی لوگ سیالکوٹ کی علمی ادبی فضا اور دہشت گردی کے مفہوم سے پہلے کے رومینٹک زمانے دونوں کی پسندیدگی لازم تھی تب لڑکے لڑکیاں بوڑھے کر کے یا نوکری کے انتظار میں عمر رسیدہ کر کے شادیاں نہیں ہوتی تھیں دو چار برس سسر ساس بھی نئے جوڑے کو کھلا پلا دیتے تھے- ذمہ داری پہلے ڈالی جاتی اور نوکریاں بعد ازاں خود ہی اختیار کر لی جاتیں معاشرہ رومانٹک فلموں منگنیوں شادیوں مہندیوں اور سادگی کا حسین امتزاج بنا ہوا تھا 60 کی دہائی کی خواتین پھرتا عمر رومانس کی فضا میں رہیں شوہروں سے محبت شک وشبہ اور غمگین نغمے غزلیں گیت بھی سب تھا......

کچھ عرصہ تو دادا دادی نے دونوں کا بوجھ اٹھایا بچوں کی پیدائش شروع ہوتے ہی دادی جس نے اپنی چھ بیٹیوں کی ذمہ داری اٹھائی تھی والدین کی تعلیم کے خرچ اور دیگر ضروریات سے دامن کھینچ لیا......

وہاں سے نکلے تو سیدھے محلہ آجڑیاں عقب پرانا سول ہسپتال سیالکوٹ کے ایڈریس پر میرے سمیت وارد ہوئے نانا نے امی کا نہایت محبت سے استقبال کیا صبح صبح خالص دودھ لاتے خود بھی کسرت کرتے ماموں کو بھی کرواتے دودھی (بادام اور پستے کی دودھ میں گھلاوٹ) بناتے بڑی کڑاہی میں گوشت پکتا عین صحن کے بیچ چولہا جلا کر ماموں اور نانا آسمانی رنگ کا تہہ بند باندھے خود ڈوئیاں چلا رہے ہوتے-

روٹی، لسی پانی سے فراغت کے بعد ململ کے کرتے اور گرگابیاں پہنے نانا خاندان کے تمام بچوں سے ڈنڈ پیلواتے گھڑ سواری ان کا محبوب مشغلہ اور گرواش پور میں برجس پہنے چابک چلانے کی یادوں کا شاخسانہ تھا......

ڈلہوزی میں بھی تعینات رہے تھے......

مجرموں کو گولی مارنے کا بھی شہرہ رکھتے تھے

ادھر ہمارے پاپا انجینئرز کی اولاد تھے پردادا شرف احمد مکمل انگریز لگتے تھے 52 برس انگریزوں کے ساتھ Boc میں نوکری کی تھی آسام بنگال کے گھنے جنگلوں سے ہاتھیوں کی سواری اور خوشبودار چائے پتی کی یادیں لائے تھے بڑی پھوپھیاں کلب میں میم صاحبوں کے ساتھ ٹینس اور بیڈمنٹن کھیلا کرتیں- چھ پھوپھیوں میں ایک کراچی لمیٹڈ کی چیمپئن

تھی...... سب کار ڈرائیو کرتیں بال ترشواتیں رہن سہن کھانا پینا انگریزوں کی تقلید میں تھا سلیولیس اور ہیئر سٹائل چچا انگریزی ہیروز عمر شریف گریگری پیک کے انداز اپنائے ہوئے تھے اُس زمانے میں میز کرسی پر کھانا فریج کا ہونا اور دیگر آلات مغربی انداز میں ترقی کا ضامن تھا آسام سے آکر پردادا نے کشمیری محلے میں پانچ مکان خریدے تو سیٹھ مشہور ہو گئے تو محلے کے تیلی، ماچھی، بلواہ سے از خود سہ پہر میں دادی کے حضور پیش ہونے لگے۔

والدہ کی زیادہ دلچسپی اپنے امتحانوں اور تقریروں کی تیاری میں رہتی گھریلو کام کاج میں امی اور دادی کے درمیان سمندر جتنی دوری تھی دادی خالی تعلیم کو اہمیت نہیں دیتی تھیں اُن کے نزدیک سلیقہ ہنر فیشن اور جدیدیت اہم تھی۔

تھانیداروں کی بیٹی لانگ جمپ ہائی جمپ تقریر وتحریر اور لباس سے لاپرواہ لفظوں کی پوجا کی اور دادی کی کیسے بن سکتی۔ امی پاپا کی شادی محض تھرڈ ایئر میں ہوئی تھی والدہ تو بی اے کر گئیں جبکہ پاپا ایف اے کے بعد پردادا کے اکاؤنٹ سے پیسے نکلوا کر اپنے دو بھائیوں سمیت غائب ہو گئے والدہ بتاتی ہیں پاپا جی مسکراتے رہتے کہتے اپنے دادا کا مال نہیں کھائیں تو کیا کسی اور کا...... امی کو تیل پانی کا خرچ بھی پاپا جی دیتے اس تذکرے میں میرے دادا محمد دین احمد مفقود ہیں کر وہ حقیقت میں بھی اکلوتے تھے والد کے اکلوتے لاڈلے بیٹے تھے بارہ برس تک بابا جی نے اُن کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے ڈال رکھے تھے انجینئرنگ کی تعلیم میں بدلتے زمانے کو دیکھ کر کڑے تو اتار لیے گئے لیکن دادا کی بے نیازی اور لاڈلا رویہ قائم رہا۔ انجینئر بن کر اپنی شرائط پر کوکا کولا میں بھرتی ہوئے پورے تین بجے سہ پہر پانی بنائی ہوئی عجیب و غریب گاڑی پر فیکٹری جاتے۔

پرانی برینڈڈ گاڑیاں خریدنا ٹھیک کرنا ہیٹ اور کیلس پہننا اُن کا سٹائل تھا پاپا مع دونوں چچا پیسے ختم ہونے پر لوٹ آئے پردادا نے شکر ادا کیا دادی نے میری پیدائش زیادہ دودھ پینے امی کے خرچے اور لاپروائی پاپا کا لااُبالی پن دیکھ ہمیں نانا کی طرف بھیج تو دیا پاپا کا ادھر ارجسٹ کرنا تھانیداری لہجہ اور زبان اور پاپا کا تیز غصہ لہٰذا گھر میں رونق لگی رہتی بچوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ہم چھ بہن بھائی محلہ آجڑیاں عقب پرانا سول ہسپتال تھانیداروں کے گھر پلتے رہے امی تمام تر معاملات کے ساتھ پڑھتی رہیں انگریزی ادب میں ایم اے اور قانون کی ڈگری لی لاہور لاء کالج میں مسٹر امتیاز کی سٹوڈنٹ بنیں کبھی اپنی خالہ تو کبھی ہوسٹل قیام کرتی رہیں اس دوران جیسے تیسے پاپا کا بی اے کا داخلہ پیسے جوڑ کر بھیجتیں جو وہ راہ ہی میں کھا جاتے نہ ڈیٹ شیٹ آتی نہ امتحان

میں بیٹھتے...... پیسے کی تنگی اور میرے دودھ
کے لیے پشاور لیور برادرز میں بھرتی ہو کر
چلے گئے امی اُن کی تعلیم پر مُصر رہیں اور
بالآخر پاپا کو اپنی نگرانی میں امتحان گاہ پہنچایا
جہاں پاپا نے ممتحن سے سگریٹ پینے کی شرط
پر کمرہ امتحان میں بیٹھنے کا عندیہ دیا والدہ نے
منت زاری کر کے یہ سہولت پاپا کو دلوا دی
اور لیور برادرز کی ساڑھے تین سو روپے کی
نوکری سے بچے ہوئے پیسوں کی کتابیں
داخلہ اور ایم کی تیاری نے یہ مرحلہ طے کروایا
رزلٹ آیا تو والدہ نے ٹاپ کیا تھا نہ جانے وہ
کون سی آنکھ تھی جو والدین میں یہ سارا ہنر
خود ہی For see پیش بینی کر چکی تھی پھر
دونوں پڑھتے چلے گئے ماسٹرز ڈگریاں
تلاش معاش روزگار کبھی لاہور کبھی سیالکوٹ
تاہم ابھی احاطۂ تحریر میں سیالکوٹ محلہ
آجڑیشاں عقب پرانا سول ہسپتال ہے
پرانے سو ہسپتال کے نام ہی سے ظاہر ہے
کہ نیا سول ہسپتال بھی بن چکا ہو گا تاہم
پرانے سول ہسپتال کی عقبی دیوار تو ہماری
کھیل کود کی آماجگاہ تھی مگر اُس کا فرنٹ
پیشانی تحصیل بازار میں کھلتی تھی تحصیل بازار
اپنی جگہ خود پورا باب لکھوائے گا ابھی اتنا کہ
یہ بازار عام بازار نہیں تھا تحصیل تو وہاں تھی
ہی پرانا ڈاک خانہ بھی اور ڈاکوؤں کے مسکن
بھی...... ہسپتال میں طبعی سے زیادہ غیر طبعی
کیسز آیا کرتے...... چلیئے واپس عقب میں

چلتے ہیں ہم نانا کے ہاں مقیم تھے نانی کا
انتقال ہو چکا تھا نانا نے اپنا انا پرستی میں محسن
اتنا ہی کمائی تھی ان کے لحاظ سے تو یہ ایک تین
کمروں والا ان اور بیٹھک والا مکان تھا یعنی
چھوٹا تھا مگر نہ جانے دگر گھروں میں اسے
بڑا مکان یا تھانیداروں کا مکان کیوں کہتے
تھے اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ اس کو تین
گلیاں لگتی تھیں یہ ایک میدان میں واقع تھا
سامنے قدرتی طور پر اینٹوں والا لان ملا ہوا
تھا اطراف دو چھوٹی گلیاں تھیں اور بھی اُن کا
نام بھی تھا یعنی ''بکی گلی'' بیٹھک اور اگر
دوسرا بیڈ روم کہہ لیں (کہ اس زمانے میں
ایسے بے شرمی والے نام نہیں ہوتے تا ورنہ
ہی ڈبل بیڈ نامی کوئی چیز) اُس کا دروازہ بھی
میدان کی طرف ہی کھلتا تھا ایک دروازہ تنگ
گلی / بھیڑی گلی میں دوسری چھوٹی گلی میں
محض کھڑکی تھی جس کی انتہا میں ایک
دروازے کے ماتھے والے مکان کے پیچھے
پورا صحن اور گھر تھا ہماری کھڑکی کے سامنے
ایک ''ستو'' خاتون کا گھر تھا جس کی بڑی
بہن ''اودی چھیماں'' کی شادی ہو چکی تھی۔
گلی میں تین چھیماں تھیں اودی چھیماں
(جو کہ تنگ گلی یعنی بھیڑی گلی میں بیاہ کر گئی
تھی) پوری چھیماں اور کالی چھیماں لکھتے
ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا مگر ایسا ہی تھا
پوری چھیماں قدیرے تانگے والے کی بیوی
اور بہت کاریگر عورت تھی اودی چھیما ہماری

بائیں بغلی گلی سے دائیں چھوٹی گلی میں بیاہ کر بچے پیدا کر رہی تھی ہمارے مکان کے تینوں دروازے دیگر دروازوں کیطرح کھلے ہی رہتے تھے بچے ایک دروازے سے داخل ہو کر شور مچاتے ہوئے دوسرے دروازے سے نکل جاتے۔ ہم خود اسی بے تکلفی سے پورے محلے میں دندناتے تھے ہمارے بہترین مشغلوں میں سواہ (راکھ) سے برتن مانجھتی پرانی مائیوں کو چھیڑ کر گالیاں کھانا تھا...... تائی تائی کھویا ملائی...... اور پھر جواب میں ایسی ایسی اشتہا انگیز گالیاں جو بس تھانوں ہی میں سنی کہ وہاں بھی ہم ملحق گھروں میں رہ چکے تھے ہمارے ماموں جب بڑے گھر اور دیگر مشہور تھانوں میں ایس ایچ او لگتے تو ہم ملحق گھروں میں رہتے اور چوروں کو چھتر پڑتے دیکھ کر خود بھی آوازیں لگاتے...... ہائے ے ے بزرر گیا......

دوسرا ہمارا بڑا مشغلہ سول ہسپتال کی دیوار پر مٹر گشت کرنا تھا وہ اتنی ہی چوڑی تھی کہ ایک بندہ آرام سے چہل قدمی کر لے تاک میں رہتے تھے کہ پرائیویٹ کمروں کے کچن اور عقبی صحن اسی دیوار سے ملتے تھے جب مرغ مسلم (اس زمانے میں مرغ کی بڑی عزت تھی) مہکتے یخنی پلاؤ اور پھلوں کی خوشبو آتی ہم پیوستہ دیوار ہو جاتے لوگ صحیح کہتے ہیں دیواروں کے کان ہوتے ہیں بلکہ حس شاما بھی ہوتی ہے اُدھر ''تڑکے'' (بھگار) لگتے اِدھر ہم لپکتے لواحقین مریضوں کو کھلاتے پلاتے اِدھر ہم بوٹیاں پھل اُڑا کر دیوار پر دوڑتے پرائیویٹ کمرے عبور کرتے آخری کونے میں بنے دارالفلاح میں آ ئے یتیم بچوں اور بیوؤں کے لیے زردہ پلاؤ کی دیگوں سے اپنا حصہ لیتے یتیم بچوں اور ہماری شکلوں میں فرق کرنا ویسے بھی مشکل تھا اس کے بعد وہیں جھولوں پر تفریح کرتے دارالفلاح میں ہونے والی ہر تقریب کا لازمی حصہ ہوتے کہ آخر میں چائے بسکٹ کوک وغیرہ میسر آئے......

ایک زمانے میں وہاں ملک معراج خالد آئے اور وہاں کی ڈائریکٹر خالدہ کے بارے میں بتایا کہ میری ''بھتیجی'' اسے ہم اُن کی پنجابی نما اردو سے محظوظ ہوتے رہے۔ غرض دن رات کھیل کود کھانے پینے دھینگا مشتی کے بعد پاپا کے دفتر سے آجانے سے پہلے واپس گھر آئے تو امی کے ہاتھ میں کتا کاغذ قلم یا کتاب ہوتی آنکھیں ان کی کسی سوچ میں ہوتیں مخروطی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا ہوتا اُس زمانے میں امی چچی ممانی سب سگریٹ پیتی تھیں کہتی تو یہ تھیں کہ کھانا ہضم کرنے کے لیے تمباکو کا بہانہ الگ تھا فرماتیں ''تہاڈے پیو نو سلگا سلگا کے سگریٹ دیون نال عادت ہوگئی (آپ کے باپ کو سگریٹ سلگا کر دیتی تھی عادت ہوگئی) امی

بے چاری کو بھی کھانا پکانا پڑتا مگر وہ ذائقے دار گوبھی گوشت پکا کر چھلکے ڈالتی سب پتے چھلکے وہیں چھوڑ واپس بیڈ پر دراز ہو کر لکھتی رہتیں۔ نانا بہت مدد کرتے امی سے محلے کی لڑکیاں پڑھائی میں مدد لیتیں امی کو انہیں دلچسپی سے پڑھاتے دیکھ کر میں بھی کتاب تھامے اُن کے پیچھے لگ گئی کبھی چولہے کے پاس تو کبھی اُن کی محلہ فیلو سہیلیوں کے گھروں میں پیچھے پیچھے۔

مجھے اور میرے بہن بھائیوں کو جے اینڈ کے اسلامک اکیڈمی عرف گوہر رحمان کے سکول داخل کروا دیا گیا تھا ہم چار بہن بھائی سکول کو روانہ ہوتے دو کے حوصلے راہ میں ٹوٹ جاتے دو کے راستے میں پکوڑے والے کی دکان آ جاتی اوپر سے ٹرین کے آنے کا ٹائم ہوتا گیٹ بند ہو جاتا ٹرین کی پٹڑی پر پیسہ رکھ کر خود بجری پر خالی تو نہیں بیٹھ جا سکتا تھا نا لہٰذا کاپی پکوڑوں والے کو بیچ کر پکوڑے خریدنے پڑتے...... مجھے خود میں اور دوسرے بچوں میں پہلا فرق یہی نظر آیا کہ میں اپنا پیسہ (سکہ) بڑا ہونے سے زیادہ (جو کہ ٹرین گزر جانے کے بعد بڑا ہو جاتا تھا) یہ مسافرت کا عمل دلچسپی سے دیکھتی رہ جاتی اور سکول کا ٹائم گزر جاتا یعنی سزا یافتہ طلباء بھی کلاسوں میں بیٹھا دیے گئے ہوتے تو میں بھی چپکے سے حقی جھاڑیوں سے بیک بنچ پر بیٹھ جاتی مگر پکوڑوں کا ذائقہ ہتھیلیوں پر چھڑیاں کھا کر نکلتا کہ ہوم ورک والی کاپی میں تو تب تک پکوڑے بک رہے ہوتے ایک تو کمبخت بھوک بہت لگتی دوسرے تب میلوں پیدل چل کر سکول آنا میری واہنی "دکھی" کمر میں درد شروع ہو جاتا اور میں ٹرین کی پٹڑی کے پاس بیٹھی آرام کرتی رہ جاتی سکول میں ایسے صبح خیز بچے ستھرے یونیفارم خاکی کور والی کاپیوں اور کنگھی چوٹی سے لیس آنکھوں میں سرمے ڈالے آئے اور بروقت آئے جو ہمارے ایسوں کی زیادہ پٹائی کا باعث بنتے......

مجھے سکول سے باقاعدہ نفرت تھی اس کی پہلی اور انتہائی تکلیف دہ وجہ صبح اُٹھانا تھا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سیالکوٹ کی سخت سردی میں دیسی روئی کی کھدر والی رضائی سلگتی کوئلوں والی انگیٹھی اور پیالیوں میں سبز چائے سے زیادہ بھی کوئی چیز حسین ہو سکتی ہے چمنیوں سے نکلتے دھوئیں میں گھلی دیسی گھی کے پراٹھوں کی مہک سانجھے کی جڑوں کا اجاڑ دیسی گھی شکر کے ساتھ کبھی کبھی انڈا اور رات کا سالن اس پرانی پڑی لکھی مس کا ساتھ جس نے بچپن میں کیسی شیلے پڑھانا شروع کر دیا تھا چھوڑ کر ایف اے میٹرک سوئیٹر بُنتی لکیر کی فقیر ہاتھوں کی پشت پر سوئیاں برساتی اُستانیاں جو ایک لفظ بھی ٹیسٹ پیپر سے الگ نہ سننا چاہتیں نہ پڑھانا چاہتیں......

امی مجھے سمجھاتیں کہ سند ڈگری لینے کے لیے نیند قربان کرنی پڑتی ہے مگر میں سمجھتی والدہ

کی رفاقت چھوڑ کر ٹیسٹ پیپر اور خلاصے والی پڑھائی اوپر سے گیس پیپر میری رہی سہی تعلیم بھی خراب کریں گے.....اس کے علاوہ بھی کئی بہانے تھے مگر سکول جانا تو جیسے مقدر میں لکھا گیا تھا یہ سلسلہ دو ہی وجوہات پر منقطع ہوتا یا تو کوئی یا بہن بھائی آ رہا ہوتا یا پھر پاپا کی نوکری چھوٹ جاتی مگر وہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی انٹرویو دیتے ہی رہتے اور جلد جاب مل جاتی مجھے غم لگ جاتا اب سب سے پہلے ہماری فیسیں جائیں گی اور سکول بحال ہو جائے گا اس وقفہ تعلیم نے مزید ہڈ حرام کر دیا ہوتا میری آنکھوں سے سُرمے والے آنسو بہہ رہے ہوتے ربن میں بندھے بال نوچ رہی ہوتی آدھا محلہ ٹانگیں بازو کھینچ کر سکول چھوڑ کر آتا وہاں وہیں رٹو طوطے بچے پہلی قطار میں بیٹھے داد وصول کر رہے ہوتے اور مجھے مارے نیند اور رنج کے کبھی صفحہ ہی نہ مل رہا ہوتا کہ پڑھایا کہاں سے جا رہا ہے۔ میں راستے میں تندوروں پر دوائیاں لٹاتی عورتوں کو دیکھتی کھیلتے ہوئے بچے کسی کسی بچے کے کانوں کے پاس ''کنوئیں'' نکلے ہوتے کوئی گلہ خراب ہونے پر ''چیوڑوں'' کی گلی میں وٹا کروانے یا گلے ملوانے جا رہا ہوتا تحصیل بازار میں جراح بیٹھے گردن کے بل نکال رہے ہوتے اتنی تو تعلیم بکھری پڑی تھی رستوں میں اور میں نہ جانے نیلا یونیفارم پہنے کیا لینے جایا کرتی میٹرک کی سند جسے تعلیم کا دروازہ کہا جاتا ہے سب سے بڑا آزار تھی میرے لیے نہ جانے کب ہوگا اور کب کالج کی کھلی فضائیں آئیں گی سنا تھا کہ وہاں دیر سے بھی جا سکتے ہیں۔

اسی دوران بڑے ماموں تبادلہ ہو کر سیالکوٹ آ گئے مع اہل و عیال ہمارا رہنا دوبھر ہو گیا دھدھیال میں ویسے ہی خلد سے نکلے ہوئے کے موافق تھے لہٰذا معروف ''جامنوں محلے'' میں چلے گئے اسی دوران چھوٹے بھائی کی آمد امی کا ہسپتال میں پانچ ماہ رہنا میری تعلیمی سلسلے کے منقطع ہونے میں معاون ہو گیا۔

امی جب ہسپتال سے واپس لوٹیں تو امتحان سر پر تھے سکول نے میرا داخلہ بھیجنے سے انکار کر دیا امی نے پرائیویٹ آٹھویں کا داخلہ بھیجا کمزوری اور بیماری میں چولہے کے پاس بیٹھی مجھے پڑھاتی رہتیں مجھے محض امی کے خیال سے مڈل پاس کرنا پڑا امی نہایت خوش ہو کر اپنے آبائی سکول لیڈی اینڈرس مجھے لے گئیں نویں میں داخل کروایا مس ٹیونگ اُن کی پسندیدہ ٹیچر واپس آسٹریلیا جا چکی تھیں سترہ برس کی عمر میں برصغیر آئیں اور 70 برس کی عمر میں واپس آسٹریلیا جا کر اپنے منگیتر سے شادی کی ایسی عظیم عورت کی پسندیدہ شاگرد میری ماں نے پہلے میرے باپ کو پڑھایا پھر مجھے۔

☆☆☆☆☆☆

غزل

پیاس بُجھا لے پیارے
چلے لہُو کے دھارے

کمھلائے ، کجلائے
دُکھ سارے ، سُکھ سارے

تمہی ہمیں پہچانو!
کوئی تو پتھر مارے

دُھوپ کے رُوپ میں دیکھے
ساتوں رنگ تمہارے

بُجھی بُجھی آنکھوں میں
سپنوں کے چمکارے

دھرتی پر ہم تم ہیں
نیل گگن پر تارے

صحراؤں کے بیٹے
شہروں میں بنجارے

ناز نیاز سے عاری
فن سے تہی فن پارے

اندھے کھوج رہے ہیں
ساون کے اُجیارے

شہرِ اَنا میں خالد
کون کسی کو پُکارے

خالد احمد

غزل

مثال ایسی بنیں نہیں ہے
ہمارے جیسا کہیں نہیں ہے

بہت سے دیکھے ہیں لوگ ہم نے
کوئی بھی ان میں حسیں نہیں ہے

چراغ چہرے کا جب ہوا گُل
وہ شخص زہرہ جبیں نہیں ہے

اثر کرے گا یہ دل پہ کیسے
کلام جب دل نشیں نہیں ہے

مکاں بنانے کا ڈول ڈالیں
ہماری لیکن زمیں نہیں ہے

خموشیاں ہیں محیط اس میں
مکاں کے اندر مکیں نہیں ہے

دماغ خوشبو سے بھر ہی جائے
خیال ہی عنبریں نہیں ہے

یہ دل عجب واقعہ ہے ثاقبؔ
جہاں تھا پایا وہیں نہیں ہے

آصف ثاقب

غزل

یہ سلسلہ ہے عجب ، سربسر ، بنایا ہوا
یہ دل ، دلوں میں یہ شوقِ سفر ، بنایا ہوا

بنی ہوئی سرِ قرطاس اک خیال کی دھوپ
او اُس میں سایہ کناں اک شجر بنایا ہوا

تھکے ہوئے در و دیوار ہیں نہ دو دستک
کہ گر پڑے نہ کہیں گھر کا گھر بنایا ہوا

بجا ہے ہم پہ اگر آپ کی ہے مشقِ ستم
ہمیں نے آپ کو ہے معتبر بنایا ہوا

زمانہ یوں ہے کہ جیسے کوئی حصارِ کہن
بنا کے ، توڑ کے ، بارِ دگر بنایا ہوا

کبھی لبھاتا ہے مجھ کو کبھی ڈراتا ہے
کسی خیال کے کاندھوں پہ سر بنایا ہوا

جو زندہ آئے وہ رکھے سنبھل سنبھل کے قدم
ہے مُردگاں نے بہت کرّوفر بنایا ہوا

مری بیاضِ تمنا میں ہے بس ایک ہی نقش
سو وہ بھی آپ کے زیرِ اثر بنایا ہوا

ہمیں تو قبلہ نما ہے وہ روزنِ دیوار
سو ہم نے ہے اُسی جانب کو در بنایا ہوا

بس آنکھ میچ کے صدیوں کے پار جا نکلیں
یہ راستہ ہے ، بہت مختصر ، بنایا ہوا

تو پھر یہ سوچ کہ کیا بن سکے گا آخرِ کار
یونہی مٹاتے رہے ہم اگر بنایا ہوا

خورشید رضوی

غزل

حسابِ درد میں درجوں کی حد بناتے ہوئے
کچھ اور کم ہوئے خود کو عدد بناتے ہوئے

نہ گھیر لے کہیں تخفیفِ منزلت کا عذاب
زرِ جنوں کو سفالِ خرد بناتے ہوئے

ہمارا چاند کسی اور کے اثر میں رہا
ہمارے بحر کے سب جزر و مد بناتے ہوئے

فلک سے ہی تو نہیں سہو ہو گیا کوئی
زمیں پہ سلسلۂ نیک و بد بناتے ہوئے

عجیب حالِ دگر میں رہا شعورِ جمال
سرِ خیال ترے خال و خد بناتے ہوئے

اٹھے جو دل سے دعا ٹال دے ہر ایک بلا
کہیں سے کوئی سبیلِ مدد بناتے ہوئے

گزر گئے ہیں کئی بار خود سے بھی آگے
ہم اپنے حرفِ ہنر مستند بناتے ہوئے

تُو اپنے دل سے تو اک بار پوچھتا یارا
مرے خلاف کوئی وجہِ کد بناتے ہوئے

وہ آپ اپنی بھی تردید کر گئے عالی
مری دلیلِ محبت کا رد بناتے ہوئے

جلیل عالی

غزل

یہ مرے عشق کی شریعت ہے
آپ کو دیکھنا عبادت ہے

خالقِ خشک و تر کا عاشق ہوں
ہر حسیں چیز سے محبت ہے

میں ہر انساں سے پیار کرتا ہوں
یہ ہی میرے نبیؐ کی سُنّت ہے

ہم فقیروں کے واسطے تیرا
سامنے آنا بھی سخاوت ہے

یہ جو میں ایسے شعر کہتا ہوں
یہ مرے عشق کی بدولت ہے

اے پری چہرہ! تجھ کو کیا معلوم
تیرے جلوؤں میں کیا اشارت ہے

اہلِ دنیا کو کیا بتاؤں ، تُو
استعارہ ہے یا علامت ہے

آپ کو دیکھتے ہیں جیتے ہیں
زندگی آپ کی عنایت ہے

نقش تیرے پکارتے ہیں مجھے
تیری آواز ہے کہ صورت ہے

باقی مکر و فریب ہے سارا
اک ترا حُسن ہی حقیقت ہے

میری خوش بختی اور کیا ہو گی
سامنے میرے، تیری صورت ہے

تیری ہر بات مانتا ہوں میں
میرے دل پر تری حکومت ہے

ہر گھڑی تیرا دھیان رہتا ہے
''زندگی کتنی خوبصورت ہے''

جمیل یوسف

غزل

چُھٹا جو گھر تو کوئی اور ہی لگے خود کو
ہم اپنے شہر میں بھی اجنبی لگے خود کو

کسی سبب کبھی پینے سے اجتناب کیا
تو بادہ خوار نہیں ہم ولی لگے خود کو

بنے تھے رندِ بلا نوش ہم ڈرامے میں
مگر بہکتے ہوئے واقعی لگے خود کو

ہمارے سامنے تھی رات سرگزشت اپنی
کہیں فرشتے ، کہیں آدمی لگے خود کو

ہمیں ہے خوئے تساہل ، مگر محبت کے
معاملے میں بہت محنتی لگے خود کو

کہا گیا ہمیں نازک مزاج شخص تو ہم
کراچوی ہیں مگر لکھنوی لگے خود کو

کیے شمار شعور اپنے مختلف اشغال
تو صرف ایک نہیں، ہم کئی لگے خود کو

انور شعور

غزل

کہا تھا کس نے کہ یوں آسماں اُٹھائے پھرو
سو اب یہ بارِ گراں میری جاں اُٹھائے پھرو

لگی ہے آگ جو دل میں اُسے بھڑکنے دو
نفس نفس میں تم اُس کا دھواں اُٹھائے پھرو

زمین پاؤں تلے سے سرکتی جاتی ہے
جدھر بھی جاؤ تُم اپنا مکاں اُٹھائے پھرو

تمہاری بات سُنے، کس کو اِتنی فرصت ہے
لبوں پہ یوں نہ وہی داستاں اُٹھائے پھرو

رفاقتوں کا نتیجہ یہی نکلنا تھا
اب اپنی ذات کی تنہائیاں اٹھائے پھرو

ہوئے ہو تم جو شکستہ شکستِ خواب کے ساتھ
اب اپنی ٹوٹی ہوئی کرچیاں اٹھائے پھرو

بس آیا چاہتی ہے ساعتِ نشاطِ وصال
کچھ اور دم یہ غمِ رفتگاں اٹھائے پھرو

کم اعتباری دُنیا کا یہ تقاضا ہے
یقین دفن کرو اور گماں اُٹھائے پھرو

تلاشِ موسمِ گُل میں سہولتیں ہوں گی
جو تُم اثاثۂ عہدِ خزاں اُٹھائے پھرو

جو روشنی نے تمہارے لہُو میں بھر دی ہیں
اب اپنے ساتھ وہ تاریکیاں اُٹھائے پھرو

سفر کے بعد بھی بھولے نہ داستانِ سفر
سروں پہ گردِ رہِ کارواں اُٹھائے پھرو

عجب سزا یہ ملی ہے کہ موت آنے تک
یہ اپنی زندگیٔ رائیگاں اُٹھائے پھرو!

نسیم پہلے اُتارو یہ تیر سینے میں
پھر اِس کے بعد یہ خالی کماں اٹھائے پھرو!

نسیمِ سحر

غزل

کھل گیا شاید لبوں پر تشنگی کا ذائقہ
خون کی ہر بوند میں ہے زندگی کا ذائقہ

خود ستائش کے جلو میں، آگہی کے زعم میں
بارہا چکھا ہے میں نے گمرہی کا ذائقہ

تیرگی میں، ماہ و انجم کی ضیا بڑھ جاتی ہے
غم کی قربت سے نکھرتا ہے خوشی کا ذائقہ

گمرہی کے روز و شب کاٹے ہیں میں نے مجھ سے پوچھ
جاں فزا ہوتا ہے کتنا آگہی کا ذائقہ

خیمۂ صبر و قناعت میں بھی بیٹھو دو گھڑی
چکھ کے تو دیکھو کبھی اس سادگی کا ذائقہ

کھل گیا ہے آنکھ پر شاید بصارت کا فریب
دل سے پوچھا ہے نظر نے روشنی کا ذائقہ

کیوں گمانِ مطربہ ہے اشک کی ہر بوند پر
آنسوؤں نے چکھ لیا ہے کیا ہنسی کا ذائقہ

دل تو دل ہے روح کی وادی میں بھی موجود ہے
آج میری آنکھ کی تازہ نمی کا ذائقہ

اس پہ کوئی تبصرہ بینائی کر سکتی نہیں
آنکھ نے چکھا نہ ہو جس روشنی کا ذائقہ

خاص اک نسبت ہے اس کی آدمی کی ذات سے
ہر کسی کے خون میں ہے بے حسی کا ذائقہ

ایک ہی جیسی ہے لذت، ایک جیسا ہے سرور
بے خودی کا ذائقہ ہو یا خودی کا ذائقہ

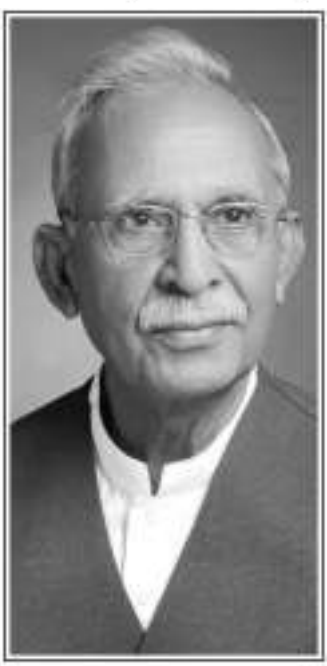

رفیع الدین راز

غزلیں

یہ کس گلاب کا ہے انتظار ایک جگہ
کھڑے ہُوئے ہیں جو باغ و بہار ایک جگہ

خبر ہے چاروں طرف تازہ پھُول کھلنے کی
اکٹھے ہونے لگے ہیں جو خار ایک جگہ

تری طرف ہے تو میری طرف بھی آئے گی
کبھی ٹھہرتی نہیں ہے بہار ایک جگہ

ہَوائے دہر پریشاں ہے اس حقیقت سے
چراغ جلتا ہے کیوں بار بار ایک جگہ

کہاں کہاں نہیں دُنیا میں ہم سے مجنوں صفت
دو چار ایک جگہ ہیں دو چار ایک جگہ

حضور یار نیا شکوہ دل کو ہے شاید
سمٹ رہا ہے پُرانا غبار ایک جگہ

چلو یہ میرا دم نزع ہی غنیمت ہے
ہُوئے تو جمع کبھی میرے یار ایک جگہ

خاور اعجاز

خواب میں ہار پروتے ہُوئے رہ جاتے ہیں
فصلِ گُل! ہم یونہی سوتے ہُوئے رہ جاتے ہیں

دامنِ غیر تو بھر جاتا ہے لیکن اکثر
تیرے بندے تیرے ہوتے ہُوئے رہ جاتے ہیں

لوگ ملبوس بدل لیتے ہیں پل میں اور ہم
داغ پندار ہی دھوتے ہُوئے رہ جاتے ہیں

فصل کٹ جاتی ہے بیتاب سروں کی اور وہ
امن کا بیج ہی بوتے ہُوئے رہ جاتے ہیں

بیت جاتی ہیں مہکتی ہُوئی عمریں اور لوگ
سانس کی گٹھڑیاں ڈھوتے ہُوئے رہ جاتے ہیں

غزل

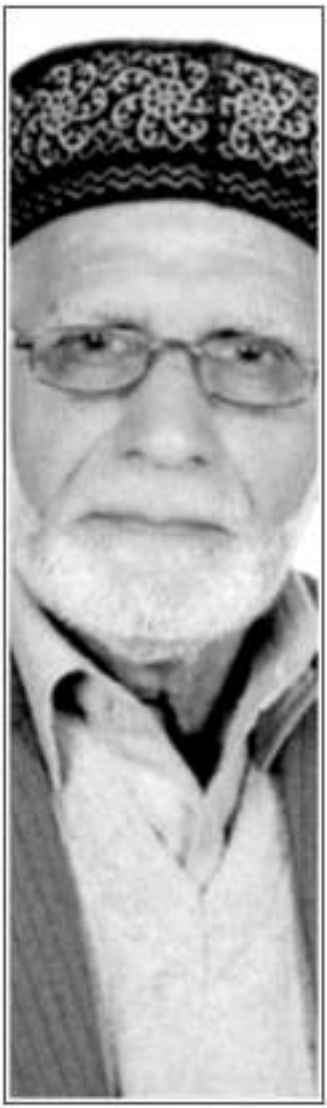

قضا رہتی ہے ہر پل زندگانی کے پسِ پردہ
حقیقت جیسے مخفی ہو کہانی کے پسِ پردہ

بشر خاطر میں کب لاتا ہے تخلیقی مراحل کو
بڑھاپا گو ہے اِستادہ جوانی کے پسِ پردہ

تغافل ہے اِدھر گر تو اُدھر بے اعتنائی ہے
عوامل ایک سے ہیں بدگمانی کے پسِ پردہ

مرے شہرِ وفا میں یہ عجب طرزِ خطابت ہے
ملے درسِ جفا شیریں بیانی کے پسِ پردہ

یہی تو بدنصیبی ہے چمن اُن کے حوالے ہے
جو کاٹیں نخلِ نو کو باغبانی کے پسِ پردہ

مکافاتِ عمل کی سمت قدرت کا اشارہ ہے
مسلسل ہر بلائے ناگہانی کے پسِ پردہ

بظاہر خادمِ اعلیٰ ہیں لیکن یہ خدا جانے
عزائم کیا ہیں ان کی حکمرانی کے پسِ پردہ

امر ہوتے ہیں جو بھی آفریں وہ جانتے ہیں سب
مقامِ جاوداں ہے دارِ فانی کے پسِ پردہ

رشید آفرین

غزل

ہنگامِ رخت ، وقتِ مناجات ہے کہیں
سورج دمک رہا ہے کہیں رات ہے کہیں

چہرے بجھے بجھے ہیں تو آنکھیں دھواں دھواں
کیا ان دنوں بھی نور کی برسات ہے کہیں

کرتا ہوں کوئی بات تو سنتا نہیں کوئی
شاید مرا عدو بھی مرے ساتھ ہے کہیں

گن سے ہوا ہے عالمِ ادراک جل ترنگ
آثارِ حمد ہیں کہیں تو نعت ہے کہیں

کیا آؤں گا میں آئنے کے روبرو کہ آج
میں ہی کہیں ہوں اور نہ میری ذات ہے کہیں

عجلت بھرے وجود نہ حسرت زدہ دماغ
اس شہر کے نواح میں دیہات ہے کہیں

اک خوف ہے جو دل سے ابھی تک نہیں گیا
جیسے ورائے فتح کوئی مات ہے کہیں

ساجد کسے ہے میرے سوا مجھ پہ اعتبار
کیا جانیے کہ مجھ میں کوئی بات ہے کہیں

غلام حسین ساجد

غزل

جن کے صدمے اٹھائے بیٹھے ہیں
ان کو دل میں بٹھائے بیٹھے ہیں

سرنگوں ہے غرور کا پرچم
آج سر کو جھکائے بیٹھے ہیں

آج رسماً ہی مسکرا دیجے
آج تو لوگ آئے بیٹھے ہیں

سرخ آنچل ہے، پیلے کنگن ہیں
اور مہندی لگائے بیٹھے ہیں

تیری چاہت کے ساحلوں سے پرے
ہم سمندر اٹھائے بیٹھے ہیں

اے فلک! ہم تری بلندی کو
اس زمیں سے ملائے بیٹھے ہیں

کوئی تاروں کو توڑ لایا ہے
کوئی سورج کو لائے بیٹھے ہیں

کون ہے محوِ آئنہ داری
آئنے چوٹ کھائے بیٹھے ہیں

اب کرم ہو خدائے شعر و سخن
جوت ہم بھی جگائے بیٹھے ہیں

وصل پیروں میں روند کر شاہد
ہجر سر پر اٹھائے بیٹھے ہیں

افتخار شاہد

غزل

اتنا مسرور نہ ہو دیکھ کے سُندر چہرے
وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں اکثر چہرے

دم بخود رہ گیا سفاک لُٹیروں کا گروہ
گھر سے جب نکلے محافظ بھی چھپا کر چہرے

آج یادوں کے شفق رنگ دریچے مت کھول
ورنہ سونے نہیں دیں گے تجھے شب بھر چہرے

سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا سینے میں
جب کبھی اُبھرے ہیں یادوں کے اُفق پر چہرے

دل میں جب خواہشِ دیدار کے شعلے بھڑکے
کھا گیا وقت کا بے رحم سمندر چہرے

ہم نے بدلیں نہ کسی راہ پہ اپنی آنکھیں
گو وہ ملتے رہے ہر بار بدل کر چہرے

جانے کیا سوچ کے ہاتھ اس نے ستم سے کھینچا
خوں میں تر ہونے لگے جب تہہِ خنجر چہرے

لوگ چپ چپ ہیں تو ہرگز انھیں بے حس نہ کہو
شدتِ غم سے بھی بن جاتے ہیں پتھر چہرے

اب بھی ماضی کو بھلانے میں ہوں مصروف جلال
اب بھی ہیں میرے تعاقب میں برابر چہرے

سید قاسم جلال

غزل

ہم ترا انتظار کھینچتے ہیں
اور با صد وقار کھینچتے ہیں

زندگی بھی تو اک ستارا ہے
آؤ اس کا مدار کھینچتے ہیں

اشک بہتے ہیں جو بھی آنکھوں سے
ان سے دل کا غبار کھینچتے ہیں

ہجر کے اک کنویں سے وصل کا ڈول
عاشقِ دل فگار کھینچتے ہیں

کچھ رفیقوں سے بچ کے رہنے کو
گرد اپنے حصار کھینچتے ہیں

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر میل پہ وہ پتھر لگوائے نہ لگوائے
سورج ہوں، دیا کوئی دکھلائے نہ دکھلائے

غزل

گر جائے گی آخر کو یہ دیوار کسی دن
بن جائے گا اِنکار ہی اِقرار کسی دن

اِس آس پہ گزرے ہیں کئی سال مہینے
آئے گا پلٹ کر وہی اتوار کسی دن

مانگیں گے مرادیں سبھی عشاق یہاں پر
بن جائے گا مرقد مِرا دربار کسی دن

یوں دُور سے اِس دل کی سدا کیسے سنو گے
پاس آؤ، سنو، اِس کی یہ گفتار کسی دن

سنتے ہیں شِفا ملتی ہے دیدار سے تیرے
آ بیٹھیں گے در پر ترے بیمار کسی دن

بچپن سے یہی سوچتے آئے ہیں برابر
ہو جائیں گے مرضی کے بھی مختار کسی دن

خوش ہوتا ہوں میں سوچ کے دل میں یہی اکثر
بن جائیں گے پودے بھی تو اشجار کسی دن

اک تیری نظر میں تو سبھی لوگ بُرے ہیں
اپنا بھی ذرا جانچ لے کردار کسی دن

نازاں ہے تُو جن پر وہ سدا ساتھ نہ دیں گے
منہ پھیر کے چل دیں گے سبھی یار کسی دن

لگتا ہے یہ خوش فہمی حقیقت بھی بنے گی
پائیں گے سزا چوک میں غدار کسی دن

مظلوم کے ہاتھوں میں گلا ہو گا تمہارا
لگنا ہے تماشا سرِ بازار کسی دن

غزلوں کو مری عام سی کہتے ہو تو کہہ لو
آخر کو یہ کہلائیں گی شہکار کسی دن

ہر روز ہی رہتا ہے ضیاؔ! شکوہ کناں تُو
چھٹ جائیں گے تیرے سبھی آزار کسی دن

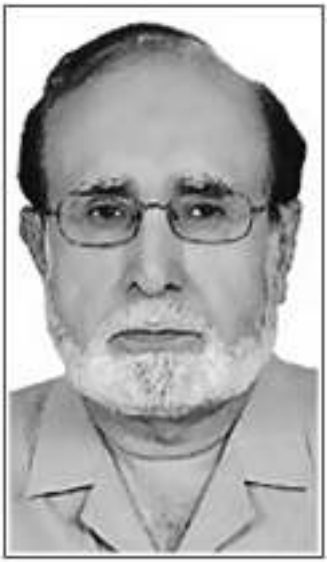

سید ضیا حسین

غزل

ہونی تو پلٹ دیتی ہے کایا نہیں دیکھا
کیا تم نے کبھی شام کو سایا نہیں دیکھا

چکر وہ چڑھے ہیں جو اترتے نہیں لگتے
کیا اس نے نگاہوں سے پلایا نہیں دیکھا

اس خواب سرائے کے دکھاوے میں نہ آنا
بس ایسا سمجھنا جو دکھایا نہیں دیکھا

ہمراہ کہیں میں نے برے وقت میں اپنے
لوگوں کو تو چھوڑو کبھی سایا نہیں دیکھا

یاروں نے تو منزل پہ پہنچ کر بھی پلٹ کر
اس دوڑ میں کس کس کو ہرایا نہیں دیکھا

آتے ہیں نظر عرش کو چھوتے ہوئے شعلے
میں نے تو کسی آنکھ میں سایا نہیں دیکھا

اس بار تو وہ لوٹ مچی شہر میں راحت
دنیا نے کوئی اپنا پرایا نہیں دیکھا

راحت سرحدی

غزل

چاند اور ستارے ہیں روشنی کے میلے میں
دل مگر اکیلا ہے زندگی کے میلے میں

شعر اور غزلیں بھی ساتھ ساتھ ہیں میرے
میں کہاں اکیلا ہوں شاعری کے میلے میں

آدمی اکیلا ہی زندگی سے لڑتا ہے
ساتھ کون ہوتا ہے بے خودی کے میلے میں

غم ملا تو ہم نے بھی راستہ بدل ڈالا
کون لوٹ کر جائے اب خوشی کے میلے میں

خوشگوار چہروں سے مل کے آ رہا ہوں میں
میں گیا تھا چپکے سے خامشی کے میلے میں

ایک اچھے ساتھی کی اب مجھے ضرورت ہے
آ گیا ہوں بھولے سے دوستی کے میلے میں

میں تو کل بھی تھا اقبال اپنی ذات کے اندر
آج بھی میں رہتا ہوں سادگی کے میلے میں

اقبال سروبہ

غزل

آخر کو مختصر ہے جگہ امتحان کی
عادت نہ ڈال اتنے کشادہ مکان کی

گہرے تھے ایک عمر سے ہم پر دکھوں کے سائے
ہم کو طلب کبھی نہ رہی سائبان کی

مدت کے بعد اس نے رہا کر دیا مجھے
لیکن وہ بات اب کہاں پہلی اڑان کی

ممکن ہے آسمان زمیں بوس ہو بھی جائے
لیکن کہاں بنی ہے زمیں آسمان کی

صد شکر اس نے گھر مرا آباد کر دیا
بربادیاں سمیٹ کے سارے جہان کی

اک سمت میں ہوں دوسری جانب مرا وجود
مجھ میں جو کشمکش ہے یہ تیر و کمان کی

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہی بھائی ، وہی بھاؤ ، وہی قدریں خالد
کیا توقّع کوئی لے کر سر بازار آئے

غزل

رونقیں ویسی کی ویسی ہیں مگر باقی نہیں
تھی کتابِ زندگی میں جو خبر باقی نہیں

رات بھر پھر کس لیے ہے سرگراں وحشی ہوا
کوئی بھی تو قرض اِب عشاق پر باقی نہیں

اِک سفر واجب ہی رہنا ہے مسافر پر ترے
لوگ بولیں گے وگرنہ خیر و شر باقی نہیں

وقت میلہ گھوم آیا ہے اگرچہ ہر کوئی
پھر بھی کہنا ہے غلط کوئی سفر باقی نہیں

ایک آہٹ کس لیے بیدار رکھتی ہے تجھے
جنگ ہے تُو ہار بیٹھا اور سپر باقی نہیں

ریت چادر پر اُتر آئیں پرندے کس طرح
لہر کوئی تیرے دریا میں اگر باقی نہیں

عادتاً ہے لکھتا رہتا عظمی اپنی داستاں
"سطرِ محکم کے اندر بست و در باقی نہیں"

اسلام عظمی

غزلیں

سر پہ اس کا سوار بھوت ہوا
عشق بھی ، تارِ عنکبوت ہوا

شربتِ دید ، واسطے اپنے
صورتِ قُوتِ لایموت ہوا

تیرے جانے سے خانۂ دل میں
مرگ آسا کوئی سکوت ہوا

فرض ، جس کو کیا تھا لاینجل
وہ بھی ثابت ہوا ، ثبوت ہوا

شوکت محمود شوکت

سایہ، برگد کا گھنیرا نہیں ہونے دیتے
میرے ڈیرے کو وہ ڈیرا نہیں ہونے دیتے

چند پروردۂ شب، آج بھی ہیں دنیا میں
جو کسی طور ، سویرا نہیں ہونے دیتے

شام ہوتے ہی تری یاد کے جگنو، اکثر
قریۂ دل میں اندھیرا نہیں ہونے دیتے

وہ تو شامل ہے میری روح کی گہرائی میں
اہلِ دنیا ، جسے میرا نہیں ہونے دیتے

شہرِ جاناں میں گزارے ہوئے لمحے، شوکت
شہرِ دیگر میں بسیرا نہیں ہونے دیتے

غزل

یہ جہاں کتنا خوب صورت ہے
الاماں! کتنا خوب صورت ہے

یہ پرندے ہٹیں تو دیکھوں میں
آسماں کتنا خوب صورت ہے

کوئی چلتا ہے ساتھ ساتھ مرے
یہ گماں کتنا خوب صورت ہے

جھیل ہے، شام ہے، ترا غم ہے
سب یہاں کتنا خوب صورت ہے

جیسے مونے کا شاہکار کوئی
یہ سماں کتنا خوب صورت ہے

ڈوبتے ڈوبتے کھُلا ہم پہ
بادباں کتنا خوب صورت ہے

حامد یزدانی

غزل

پاس بیٹھے رہیں ، ہاتھ تھامے رہیں
تم بھی جیتی رہو ، ہم بھی جیتے رہیں

عشق ہے تو رکھیں گفتگو کا بھرم
بات رونے کی ہو تو بھی ہنستے رہیں

ایک دوجے کے بیمار ہوں دونوں ہم
اور بیمار ہو کے بھی اچھے رہیں

بات کی ہر گرہ خود ہی کھل جائے گی
تم بھی چپکی رہو ہم بھی چپکے رہیں

زندہ رہنے کی خواہش کے پیش نظر
اوپری دل سے ہی عشق کرتے رہیں

صاحبِ وقت ہیں کیوں رکیں اک جگہ
آ کہ ملتے رہیں اور بچھڑتے رہیں

تم سے ملنے کے اوقات اپنی جگہ
باقی اوقات میں تنہا کیسے رہیں

حسن مغلوب ہے یہ خوشی ہے مگر
عشق کا اِذن ہے سہمے سہمے رہیں

محسن اسرار

غزل

وہ زیاں لایا ہے دل
خود سے بھر پایا ہے دل

کس بھروسے پر جیا!
کیسا پچھتایا ہے دل

کیا کہوں کس کس گلی
ٹھوکریں کھایا ہے دل

پوچھیے مت اِس گھڑی
کس نے کلپایا ہے دل

زخم ہے خود ہی کہیں
اور کہیں پھایا ہے دل

نقش ہے اس پر تمام
کچھ جو بسرایا ہے دل

بھولنا بھی ہے دوا
"ایسا فرمایا ہے دل"

سود ہے جس کا زیاں
ایسا سرمایہ ہے دل

عاقلاں کے مشورے
غور کر آیا ہے دل

جی میں آئی، ٹھان کر
رقص فرمایا ہے دل

ہاتھ سے کیوں جانے دے
تجھ پہ گر آیا ہے دل

درد، اپنا ہے سفر
کون ہم پایہ ہے دل

کیا رکھوں رختِ سفر
ساتھ جب آیا ہے دل

طارق بٹ

غزل

لاکھ خاموش رہوں پھر بھی یہ غم بولتا ہے
دل فسردہ ہو تو خود آنکھ کا نم بولتا ہے

اُس کے لہجے سے جھلکتی ہے کہانی اُس کی
اُس کے چہرے پہ لکھا جور و ستم بولتا ہے

وہ تو حیرت سے نکلنے نہیں پاتا پل بھر
ساتھ چلتا ہے تو ہر ایک قدم بولتا ہے

بات کرتا ہے کسی تلخ لب و لہجے میں
جب رگ و پے میں کسی یاد کا سم بولتا ہے

شعر خوں بن کے رگِ جاں میں اُتر جاتے ہیں
درد لفظوں کا سرِ لوح و قلم بولتا ہے

گلشنِ عالم اسرار بلاتا ہے کہیں
طائرِ غیب سرِ شاخِ عدم بولتا ہے

میری گفتار طرازی سے وہ خائف ہے شفیق
جس کو شکوہ تھا کبھی مجھ سے کہ کم بولتا ہے

شفیق احمد خان

غزل

ان کی خواہش ہی نہیں خود سے ملانے کی ہمیں
جب کہ حسرت ہے انہیں پاس بٹھانے کی ہمیں

راستہ دل سے نکلتا ہوا جائے دل تک
رہگذر کوئی نہ ہو موڑ کے لانے کی ہمیں

خار چنتے ہوئے وہ راہ گذرگاہ بنی
اور مہلت نہ ملی پھول سجانے کی ہمیں

بے صدا عشق محبت سے سِوا ہوتا ہے
آرزو ہے اُسے یہ بات بتانے کی ہمیں

سرخ ہونٹوں کی تپش آتشِ رخسار کے ساتھ
بارور ہو کبھی کوشش یہ جلانے کی ہمیں

شور انگیز نگاہوں سے ہے دیکھا اس نے
دعوتِ حسن ہے کیا خوب بلانے کی ہمیں

کافرانہ سی اداؤں پہ مسلمان مرے
دوست کیا شرط ہے یہ جان سے جانے کی ہمیں

جام لب مست خرامی سے وہ لیکے اصغؔر
اک صراحی تھی قریں ہونٹ لگانے کی ہمیں

علی اصغر عباس

غزل

نمودِ برگ پہ زردی، زمین گیلی ہے
درختِ سبز نے دریا کی پیاس پی لی ہے

تری نگاہ سے گرداب آشنا ہو جائے
اسی لیے تو سمندر کی آنکھ نیلی ہے

ستارے ٹوٹ رہے ہیں ہماری قسمت کے
سو لگ رہا ہے گرفت آسماں کی ڈھیلی ہے

حصار میں کہیں لے لے نہ پھر دل و جاں کو
تمھاری یاد کی خوشبو بڑی رسیلی ہے

اٹھی جو سینے سے، ہونٹوں میں دب گئی آواز
یہ کس طلسم نے میری زبان کیلی ہے

تو دل کی آنکھ سے دیکھے گا کیا زمانے کو
تری نظر نے چراغوں سے روشنی لی ہے

چلو یہ رات کٹی، کیا ہُوا اگر خالدؔ
نگارِ صبح کی رنگت ذرا سی پیلی ہے

خالد علیم

غزلیں

شمار کرتے نہیں مجھ کو خاندان میں تم
مجھے یہ ڈال رہے ہو کس امتحان میں تم

یہ لگ رہا ہے نہیں مطمئن نشانے سے
رکھو گے تیر بھلا کب تلک کمان میں تم

یہ مانا حُسن میں رکھتے نہیں تم اپنا جواب
کہ کامیاب نہیں عشق کی اُڑان میں تم

تمہاری بندگی کرتا ہوں دیکھنا کیسے!
حروف اپنے نہ ڈالو مری زبان میں تم

محبتوں کے خزانے بکھیرتے ہی رہیں
زمیں کی گود میں ہم اور آسمان میں تم

ہوا میں اُڑتے پرندوں کو دیکھتے کیوں ہو
اکیلے ہی پڑے رہتے ہو کیا، مکان میں تم

مجھے یقین ہے جب چھوڑ جاؤ گے مجھ کو
اکیلے ہی کہیں رہ جاؤ گے جہان میں تم

علی حسین عابدی

اہلِ دل، دل لگی سے ڈرتے ہیں
ایک ہم ہیں خوشی سے ڈرتے ہیں
اُن کو جینے کی آرزو ہے بہت
اور ہم زندگی سے ڈرتے ہیں
ٹوٹ جاتا ہے وہ جو پل بھر میں
دِل کی اُس نازکی سے ڈرتے ہیں
یاد شدت سے آ رہے ہیں وہ
ہم تو اس بے کلی سے ڈرتے ہیں
اتنا آگے وفا میں نکلے ہیں
اب تو بس بے خودی سے ڈرتے ہیں

جب خیال آتا ہے بچھڑنے کا
ہم تری بے رخی سے ڈرتے ہیں
چوٹ وہ کھائی ہے محبت میں
ہم تو اب عاشقی سے ڈرتے ہیں
ہم عدو کو گلے لگاتے ہیں
لوگ تو دوستی سے ڈرتے ہیں

غزل

ہجوم یاس تھا ، بے داریاں تھیں اور مَیں تھا
کوئی گذشتہ کی چنگاریاں تھیں اور مَیں تھا

سفر تھا اور سفر بھی عجیب دشت کا تھا
قدم قدم نئی دُشواریاں تھیں اور مَیں تھا

یہ اور بات ، کسی سے بھی کچھ نہ کہہ پایا
عجیب رنگ کی سرشاریاں تھیں اور مَیں تھا

مجھے بھی ٹھیک سے اب یاد تو نہیں ، ویسے
بس اک جدائی کی تیاریاں تھیں اور مَیں تھا

چلا تو خود سے ذرا ہٹ کے ہی چلا مَیں بھی
کہ شہر بھر کی نگہداریاں تھیں اور مَیں تھا

نوید! خیر سے خاموش ہو ، کہو کچھ تو
ہزار رنج تھے ، بیماریاں تھیں اور مَیں تھا

نوید صادق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہر کا شہر آشنا ٹھہرے
اجنبی ایک بھی گلی نہ رہے

غزلیں

کس قدر ظلم عیادت ہوا بیمار کے ساتھ
اس نے کالم بھی سناڈالا ہے اشعار کے ساتھ

صرف عاشق ہی نہیں چور بھی ہوسکتا ہے
شب کو بیٹھا ہے جو لگ کر تری دیوار کے ساتھ

بیویاں چار اگر میرے مقدر میں نہیں
کوئی گپ شپ ہی کرادے مری دو چار کے ساتھ

ہوگئی حسنِ سماعت کی روایت رخصت
اب تو غزلیں بھی سنی جاتی ہیں جھنکار کے ساتھ

اتنے ظالم نہ خدا دے کسی عاشق کو رقیب
جا کے پرچہ بھی کٹا دیتے ہیں جو مار کے ساتھ

اس کی مہمان نوازی ہے سمجھ سے باہر
کاٹ کے آم کھلاتا ہے جو تلوار کے ساتھ

بدر منیر

ہاتھ سے پل بھر میں صیدِ بے زباں جاتا رہا
سوچتی ہے اہلیہ شوہر کہاں جاتا رہا؟

روزنِ در سے نظر آیا جو مہمانوں کا غول
پچھلے دروازے سے چھپ کر میزباں جاتا رہا

بن کے دلہن اس حسیں نے جب سے رکھا ہے قدم
آشیانے سے مرے امن و اماں جاتا رہا

بن بھی سکتا ہے کسی دن تیرے پٹنے کا سبب
تو اسی رفتار سے گر اس کے ہاں جاتا رہا

گفتگو اس نے سنی جب روز مرہ کے خلاف
اہلیہ کو چھوڑ کے اہلِ زباں جاتا رہا

فون پر جب اس نے مجھ سے کھلکھلا کر بات کی
دل کے اندر تھا جو احساسِ گراں جاتا رہا

ریڈ کر کے جو برآمد کر لیا پولیس نے
بعد میں اس مال کا نام و نشاں جاتا رہا

غزل

بجھے چراغ کو پھر سے جلا دیا کس نے
مرے مزار پہ میلا لگا دیا کس نے

ملا نہیں مجھے اپنا کہیں بھی نام و نشاں
یہ مجھ کو لوحِ جہاں سے مٹا دیا کس نے

خدا کے سامنے جھکنے کا حکم ہے بھائی
یہ تجھ کو غیر کے آگے جھکا دیا کس نے

ہمارے حال پہ کس نے یہ رحم فرمایا
پرانی گور پہ سہرا سجا دیا کس نے

نہ چاشنی ہے بیاں میں نہ فکر ہے تازہ
مجھ ایسے شخص کو شاعر بنا دیا کس نے

انصر حسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ خوف تھا کہ فقط وہم تھا کہ دُھوکا تھا
نہ جانے کیا اسے خود اس سے دور رکھتا تھا

غزل

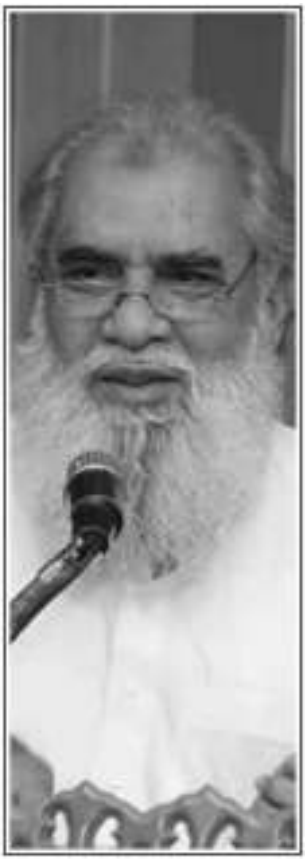

حقیقت اور ہوتی ہے ،فسانہ اور ہوتا ہے
دلوں میں پھول کھلنے کا زمانہ اور ہوتا ہے

وہ کہتا ہے،کہ پتھر کا زمانہ لوٹ آئے گا
سمجھتا ہے ،کہ پتھر کا زمانہ اور ہوتا ہے

میں اس کی بات کو، بس بات کی حد تک سمجھتا تھا
سمجھتا تھا ، بچھڑنے کا بہانہ اور ہوتا ہے

وہ جس سے بات کرتا ہے، حقیقت میں نہیں کرتا
حقیقت میں نہیں کرتا ، نشانہ اور ہوتا ہے

یہی ہے فرق کٹیا اور محل کے رہنے والوں میں
ہمارا اور ان کا آب ودانہ اور ہوتا ہے

مجھے کیا علم تھا اکرم نئی رت آنے والی ہے
نئی رت میں پرندوں کا ٹھکانہ اور ہوتا ہے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اہل زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہر جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

غزلیں

جس جس کا زبر، زیر بھی یا پیش غلط ہے
اُس اُس کا تلفظ بھی کم و بیش غلط ہے
تسبیح دکھاوے کی لیے گھومتے ہیں سب
اِس دور کا ہر ایک ہی درویش غلط ہے
کب سے ہی گلے میں ہے پڑا طوقِ غلامی
ہم کو ہے جو درپیش، وہ درپیش غلط ہے
انسان سے نفرت کا جو پرچار کرے گا
مسلک بھی غلط اُس کا ہے اور کیش غلط ہے
نرمی کے تقاضے کی ہے درخواست گزاری
ہم اہلِ محبت پہ ترا طیش غلط ہے
قبضہ تو اُسی کا ہے سبھی لعل و گہر پر
قسمت سے ہمیں جو ہے ملا، شیش غلط ہے
دے کر وہ گیا ہے ہمیں اک ہجرِ مسلسل
دل پر جو لگایا ہے وہی ریش غلط ہے
تِل بھر بھی اگر ہو تو یہ کافی ہے محبت
کیوں تو یہ سمجھتا ہے ترا خویش غلط ہے
اک وقت مقرر پہ ملے اوجِ ثریا
یہ کس نے کہا تم سے کہ راکیش غلط ہے
دستار پہ سب کی ابھی کیچڑ نہ اُچھالو
کچھ لوگ غلط ہیں یہاں، کب دیش غلط ہے

آفتاب خان

رونقِ جشنِ بہاراں میں خلل پڑتا ہے
تیرے بن صحنِ گلستاں میں خلل پڑتا ہے
تو مرے ساتھ اگر بات کرے ہنس ہنس کر
ساری ہی بزمِ رقیباں میں خلل پڑتا ہے
حجرۂ وصل کی گر شمع بجھا دی جائے
اہلِ ہجراں کے شبستاں میں خلل پڑتا ہے
میری پوشاکِ دریدہ کی نہ کر بخیہ گری
یوں مرے چاکِ گریباں میں خلل پڑتا ہے
نغمۂ عیش طرب چھیڑ نہیں نغمہ گر
گریۂ چشمِ غزالاں میں خلل پڑتا ہے
زمزمے ہجر کے جب تیری زباں سے سُن لوں
دل کے ہر سازِ پریشاں میں خلل پڑتا ہے
آ کے پہلو میں کسی شام نہ تُو بیٹھے اگر
سارے اعصابِ تن و جاں میں خلل پڑتا ہے
میری تصویر نمائش میں اگر رکھ دے تُو
نقشۂ بزمِ نگاراں میں خلل پڑتا ہے

غزل

خونِ دل سے دیے جلاتے ہیں
شہرِ جاناں کو یوں سجاتے ہیں

زندگی چاہے کرب میں گزرے
تجھ سے وعدے مگر نبھاتے ہیں

جب سے اُس دل میں ہم مقیم ہوئے
دوست حیرت سے دیکھے جاتے ہیں

جو جلاتے ہیں نفرتوں کی آگ
کب جہاں میں سکون پاتے ہیں

ہیں وہی لوگ لائقِ تحسین
دوسروں کے جو کام آتے ہیں

کیسا موسم ہے شہر پر طاری
دوست پیارے بچھڑتے جاتے ہیں

تیری گفتارِ دل نشیں سن کر
گل خزاں میں بھی مسکراتے ہیں

پھول چاہت کے جس سے کھل جائیں
گیت ہم ایسے گاتے آتے ہیں

وہ جو مسند نشیں کبھی تھے یہاں
خاک گلیوں میں اب اڑاتے ہیں

ہم ترے عشق میں اے جانِ جاں!
زخم کھا کر بھی مسکراتے ہیں

سید فرخ رضا

غزل

ایک دریا کنارے، جدھر سب کھڑے ہیں، اُدھر عکس ہے
میرے پیشِ نظر تم ہو، دُنیا کے پیشِ نظر عکس ہے

جس میں تم ہو، وہ عالَم جہاں ساز ہے، کچھ بتاؤ ہمیں
جس میں ہم ہیں، وہ دُنیا حقیقی ہے، یا عکس در عکس ہے

دائیں بائیں کئی آئینے ہیں، عقب میں کئی قُمقمے
سائے کا ہم قدم سایہ ہے، عکس کا ہم سفر عکس ہے

عکس معکوس ہو کر بھی لگتے نہیں ہیں کہ معکوس ہیں
جھیل کا چاند لگتا نہیں جو حقیقت کے برعکس ہے

لوگ دھوکے سے آ تو گئے ہیں تمھاری فُسوں گاہ میں
اب سمجھ ہی نہیں پا رہے، تم کدھر ہو، کدھر عکس ہے

خوش نہ ہو یہ سمجھ کر کہ یادیں مٹانے سے مٹ جائیں گی
لوحِ محفوظ کے آئنے میں دو عالم کا ہر عکس ہے

بحر و بر میں، چمکتی ہَوا میں، کہاں بالا دستی نہیں
موج پر موج ہے، نقش پر نقش ہے، عکس پر عکس ہے

کیوں مجازی ہمیں لگ رہا ہے، یہ پرتَو ہے اصلی اگر
کیوں حقیقی تمھیں لگ رہا ہے، یہ پیکر اگر عکس ہے

اشکِ لرزاں کے اندر تہ و بالا ہے منظروں کی شبیہ
مرتعش آبجو میں نظاروں کا زیر و زبر عکس ہے

ساحلوں پر پہنچنے میں شاہد کئی دن لگیں گے ابھی
کشتیوں کا سفر پانیوں کے بہاؤ کے برعکس ہے

شاہد ماکلی

غزل

بعد مدت کے بچھڑ جانے کا موسم آیا
پھر دلِ وحشی کے گھبرانے کا موسم آیا

نخرے ساقی ترے برداشت کریں گے پھر سے
پھر ترے جام کا، میخانے کا موسم آیا

کتنی مشکل سے بسایا تھا دلِ ویراں کو
وائے قسمت کہ اُجڑ جانے کا موسم آیا

اب مرے زخم ہرے ہونے لگے ہیں، دل برا!
اب میں سمجھا کہ ترے آنے کا موسم آیا

آ کہ گلشن پہ بہاروں نے جمایا قبضہ
آ کہ روحوں میں اُتر جانے کا موسم آیا

دیکھ راحت کی طلب میں وہ چلا صحرا کو
موسمِ گل نہیں ، دیوانے کا موسم آیا

گل کی آغوشِ رفاقت میں مقید تھی کبھی
اب تو خوشبو کے بکھر جانے کا موسم آیا

آمدِ یار کا پیغام ملا اب مجھ کو
جب بہاروں کے گزر جانے کا موسم آیا

ہونے والا ہے ترا ہجر بھی رخصت مجھ سے
"شاید اب جاں سے گزر جانے کا موسم آیا"

اب کے برسات گزارے نہ اکیلا شاعرؔ
اُس کے محبوب کو سمجھانے کا موسم آیا

شاعر علی شاعر

غزل

شکست خوردہ بنا رہے ہیں جہان آدھا
نئے مسائل پہ اُن کا ہوتا ہے دھیان آدھا

اب اس کو تزئین سے مکمل کریں گے بچے
بنا لیا ہے لہو سے اپنے مکان آدھا

لرز رہی ہے زمین ساری شکستگی سے
چیخ رہا ہے سروں پہ بھی آسمان آدھا

نہ جانے کیوں اُس پہ جرم ثابت کیا گیا ہے
دیا تھا ملزم نے تو ابھی تک بیان آدھا

اک اور ہجرت کا درد میں نے بھی سہہ لیا ہے
گنوا چکا ہے مجھے مرا خاندان آدھا

گزار کر تیز تیز دھوپوں میں عمر ساری
ملا مقدر سے بھی ہمیں سائبان آدھا

محمد نوید مرزا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی ستم نیا نہیں ، کوئی کرم نیا نہیں
مرکزِ التفات بھی ، جاں ، ہدفِ خدنگ بھی

غزلیں

دل تری یاد میں ہر غم سے جدا تھا پہلے
ان درختوں کی طرح میں بھی ہرا تھا پہلے
اب وہی نام جو ہونٹوں پہ نہیں لا سکتے
اک وہی نام تو بس حرفِ دعا تھا پہلے
تجھ کو دیکھا تو ملی جلوہ نمائی اس کو
آئنہ ورنہ کہاں عکس نما تھا پہلے
میں جو برباد ہوا خوش ہوئے چہرے کتنے
مجھ سے لگتا ہے کہ ہر شخص خفا تھا پہلے
سامنے آ کے بھی فریاد نہیں سنتا تھا
شاید اس شہر میں پتھر کا خدا تھا پہلے

اشرف کمال

غم کو بینائی، میں اندھوں کو بصارت دیتا
دینے والا مجھے اتنی تو مہارت دیتا

میں بھی تو بکھرا پڑا تھا وہیں سامان کے پاس
وہ مجھے خود کو اٹھانے کی تو مہلت دیتا

میری آنکھیں بھی جھلکتیں ترے خال و خد سے
میں وہ تصویر کو رنگوں کی تمازت دیتا

لے گیا مانگ کے خوابوں کی وہ نقدی بھی تمام
حاکمِ شہر بھی لگتا ہے گدا تھا پہلے
تم جو آئے تو چلی بادِ بہاری ہر سو
سانس لینا بھی یہاں ورنہ سزا تھا پہلے
اب جسے سوچ کے زخموں میں جلن ہوتی ہے
سچ تو یہ ہے کہ وہی میری دوا تھا پہلے

اس کے دل کے کسی کونے میں مہکتی رہتی
وہ مری یاد کو اتنی تو اجازت دیتا

شہر کا شہر کھڑا تھا مرے رستے میں کمال
کون واپس مجھے جانے کی اجازت دیتا

غزل

شبِ سیاہ میں مہتاب دیکھنے والے
کہاں ہیں لوگ نئے خواب دیکھنے والے

اب آئیں دیکھیں وہ سیلابِ اشک کا منظر
زمینِ عشق کو بے آب دیکھنے والے

سمندروں کے سکوں پر نہیں مچلتے ہیں
تہوں میں حلقۂ گرداب دیکھنے والے

تمھاری راہ میں آنکھیں بچھا کے بیٹھے ہیں
تمھارے عشق کے بے تاب، دیکھنے والے

نصابِ دہر کی اب کس کتاب پر ریجھیں
تمھارے حسن کے ابواب دیکھنے والے

فضائے رنگ میں مخمور بولتے بھی نہیں
فروزاں گوہرِ نایاب دیکھنے والے

خدا کرے کہ رضاؔ منزلوں پہ لے جائیں
سفر میں منظر شاداب دیکھنے والے

رضا اللہ حیدر

غزل

یہی نہیں کہ کنائے اشارے کچھ بھی نہیں
وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم تو تمہارے کچھ بھی نہیں

ملی ہے اُن کو یہ توقیر تیری چوکھٹ پر
وگرنہ چاند یہ سورج ، ستارے کچھ بھی نہیں

میاں! یہ عشق تو دل ، جاں ، جگر کا دشمن ہے
ملے ہیں تم کو جو اِن میں خسارے کچھ بھی نہیں

بڑے مہیب ہیں حالات جانتا ہوں مگر
بجز دعاؤں کے بس میں ہمارے کچھ بھی نہیں

مرے لیے تو سبھی کچھ یہ میری کٹیا ہے
کسی کے اونچے محل اور منارے کچھ بھی نہیں

قلق یہی ہے کہ اک جاں تھی اپنے پاس جلیلؔ
سوائے اس کے محبت میں ہارے کچھ بھی نہیں

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرم نوا رہتے ہیں

غزل

اَب کے برسات ہے یا کوئی قضا اُتری ہے
میرے کھیتوں پہ بھی بارانِ بلا اُتری ہے

پیڑ آنگن میں تھا جو خشک، وہ سرسبز ہوا
پھر مرے گھر میری اماں کی دُعا اُتری ہے

کس قدر خوش ہیں پرندے بھی، فضائیں بھی نہال
بعد مدت کے یہاں ٹھنڈی ہوا اُتری ہے

مسکرائی ہیں برستی ہوئی آنکھیں پل بھر
بھیگے پیڑوں پہ کہیں دھوپ ذرا اُتری ہے

آسماں اُجلا، فضا نکھری، ہوا صاف ہوئی
یہ وبا بن کے خلاؤں پہ شفا اُتری ہے

ہائے جس کا کبھی گھر میں بھی نہ آنچل سرکا
سرِ بازار اُسی سر سے ردا اُتری ہے

روح کے سلسلے شاداب و معطر ہیں عقیلؔ
دلِ عشاق پہ زلفوں کی گھٹا اُتری ہے

عقیلؔ رحمانی

غزل

جیتے جی اعلان میری موت کا ہوتا رہا
اِک ہجوم دوستاں میرے لیے روتا رہا

بارہا شہزادؔ میرے ساتھ یہ ہوتا رہا
جاگتا تھا جس گھڑی، میں اُس گھڑی سوتا رہا

پہلے تو جتنے گلے تھے سارے اُس نے کر دیئے
پھر مرے سینے سے لگ کر رات بھر روتا رہا

ہائے کیسا راستہ اب کے کیا تھا اِختیار
کارواں لُٹتا رہا ، اور رہنما سوتا رہا

مجھ سے تنہائی میں اکثر بات کرنے کے لیے
میرے کمرے میں مرا اِک پالتو توتا رہا

دوستوں کے گل کھلے ہیں چار سو میرے لیے
عمر ساری اُلفتوں کے بیج میں بوتا رہا

آنکھ کی نہروں میں پانی کھول کر شہزادؔ میں
خشک تھے چہرے کے برگ و بار، میں دھوتا رہا

شہزاد احمد شیخ

غزل

وہ بچھڑنے پہ رضامند نہیں ہوتے ہیں
ساتھ چلنے کے بھی پابند نہیں ہوتے ہیں

ہم سمجھ لیتے ہیں تقدیر کا اک کھیل اسے
جانے والے سے گلہ مند نہیں ہوتے ہیں

ساتھ دنیا کے کسی صورتِ مجبوری میں
ہم کھڑے ہوتے ہیں ہر چند نہیں ہوتے ہیں

ان سے آداب و رسومات سمجھنے والو
یہ جنوں پیشہ خرد مند نہیں ہوتے ہیں

حاکمِ وقت کے پڑھتے ہیں قصیدے جو لوگ
ان کے ملبوس میں پیوند نہیں ہوتے ہیں

نہیں مشروط شہنشاہوں سے آب و دانہ
رزق کے در تو کبھی بند نہیں ہوتے ہیں

دل پہ ماؤں کے بھی ہو جاتا ہے الہام اکثر
جب بھی آرام میں فرزند نہیں ہوتے ہیں

عنبرین خان

غزل

ترا بہاؤ الگ ہے الگ روانی تری
سنی سنائی نہیں ہے رضا کہانی تری

کوئی تو ہو گا جسے تو بھی راس آئے گا
کوئی تو ہو گا جسے بھائے گی جوانی تری

وہی زمینی سمجھتا ہے جس نے آج تلک
اڑان دیکھی نہیں ہو گی آسمانی تری

یہ زہر آج ہی اگلا ہے یا۔۔ بتا تو ذرا
کہ منہ بسورنا عادت ہے کیا پرانی تری

تجھے روا ہیں یہ نخرے مری بلا سے کر
تو جانتی ہے کہ ہر بات میں نے مانی تری

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد ، یا عبادت گاہ تھی
اس کے در پر سارے بے کس، سارے بے گھر سو گئے

غزل

اب تو سمجھا نہ وہ زبانی تک
یعنی بات آ گئی ہے یعنی تک

راہ میں تیری اور کیا کرتے
چھوڑ دی ہم نے رائیگانی تک

گھڑ لو تاویلیں جس قدر چاہو
سچ نے آنا نہیں کہانی تک

قدم اٹھے نہیں تری جانب
ورنہ ہم نے تو دل میں ٹھانی تک

اُس کا ہونا ، نہ ہونا ہو نہ سکا
کر کے دیکھی ہے بدگمانی تک

تکنا تکنا ہی ٹھہری سحرؔ
ہو کے آئے ہیں بیکرانی تک

حسنین سحر

غزل

یہ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں یہاں وہاں مجھ کو
تلاش کرتے نہیں اپنے درمیاں مجھ کو

میں اگلے پچھلے زمانوں سے ہو کے آیا ہوں
کہیں نظر نہیں آئے ہیں رفتگاں مجھ کو

وہ جس میں لوٹ کے آتی تھی ایک شہزادی
ابھی تلک نہیں بھولی وہ داستاں مجھ کو

یہ کس نے کر دیا صیقل زمیں کا آئینہ
تہِ زمیں نظر آتا ہے آسماں مجھ کو

عجیب شخص ہے جس نے کہیں نہیں جانا
یہ کہہ کے دیکھتا جاتا ہے کارواں مجھ کو

مجھے خبر ہے کہانی کا انت آ گیا ہے
مجھے خبر ہے کہ ہونا ہے رائیگاں مجھ کو

اشفاق ناصر

غزل

اک شوخ نظر جس کو مَیں سب سے حَسیں سمجھا
جادو تھا عجب اُس میں، کوئی بھی نہیں سمجھا

مہتاب نما چہرہ اور جھیل سی آنکھیں ہیں
زلفیں بھی گھٹا جیسی، مَیں تِل بھی نگیں سمجھا

کوشش تو بہت کی تھی تصویر نہیں بولی
شاید تھا گماں کوئی میں جس کو یقیں سمجھا

جب شام ڈھلی مجھ پر، جب خاک لگی اُڑنے
وہ میری محبت کو تب جا کے کہیں سمجھا

چاہے تُو کہیں بھی ہو، اے دوست تجھے میں نے
آنکھوں میں بسایا ہے اور دل کے قریں سمجھا

آواز مری گونجی اُس شہر کی گلیوں میں
لوگوں نے بُھلا ڈالا، جب زیرِ زمیں سمجھا

روشن تھا مرا کمرہ، ہر چیز چمکتی تھی
کچھ دیر ظہورؔ اُس کو مَیں عرشِ بریں سمجھا

ظہور چوہان

غزل

بچھڑ گیا تو ان آنکھوں کو کچھ گلہ ہی نہیں
کہ جیسے کچھ نہ ہوا ، زخمِ دل چھلا ہی نہیں

اس ایک شخص کی خوشبو میں باغ باغ رہی
جو پھول بن کے مری زلف میں کھلا ہی نہیں

کچھ ایسے لوگ بھی اک عمر ساتھ رہتے ہیں
ستارے مل گئے قسمت سے دل ملا ہی نہیں

کبھی کبھی کی ملاقات میں گیا ، کیا کچھ
وہ نرم باتیں وہ جذبوں کا سلسلہ ہی نہیں

ہم اپنے ضبط پہ حیراں ہیں شدتِ غم میں
ستارہ پلکوں تک آیا مگر ہلا ہی نہیں

رخشندہ نوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیسی ٹھنڈی ہوا چلی خالد
چاند کیا ، جَل بجھے ستارے بھی

غزل

اے جوش! اعتدال بدوشی سے کام لے
طرزِ عمل سنوار ! خموشی سے کام لے

آوازِ وقت آن پہنچتی ہے کان میں
بندہ ہزار سست نیوشی سے کام لے

سب لوگ یک لحاظ خطا کار ہیں یہاں
پردے سے اور معاملہ پوشی سے کام لے

ایسا نہ ہو تجھے زرِ دنیا خرید لے
ایسا نہ ہو کہ تو بھی خموشی کام لے

حد سے گزر گئی ہیں زمانے کی ذلتیں
خانہ خراب! خانہ بدوشی سے کام لے

ناصرؔ علی! درست بکاؤ ہے مال سب
پر تو نہ احترام فروشی سے کام لے

ناصر علی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زیبِ پا ، بیڑیاں نہیں خالد
حلقۂ اختیار سا کچھ ہے

غزل

کسی غمزدہ سے یوں حالِ دل میاں ایک دم نہیں پوچھتے
کہ جو قہقہوں میں دبا ہوا ہو وہ ضبطِ غم نہیں پوچھتے

دمِ گفتگو نہیں پوچھتے پسِ گفتگو کے ملال کو
کبھی مل بھی لیں وہ تپاک سے تو بھی اُن سے ہم نہیں پوچھتے

مری سُرخیوں بھری آنکھ پر مرے رتجگوں پہ سوال کیوں
پڑا سامنے ہو جو رختِ نم، مرے محترم نہیں پوچھتے

مرے رازداں مرے زخم کو تری پُرسشوں نے ہرا کیا
کہ جو واقفِ غمِ حال ہوں وہ تو کم سے کم نہیں پوچھتے

نہیں یاد کیا؟ تری زلف سے کبھی کھیلتی تھیں یہ انگلیاں؟
کسی لمس کا تجھے کاکلوں کے یہ پیچ و خم نہیں پوچھتے؟

کبھی التجا، کبھی سرزنش، کبھی منتوں بھری خامشی
رہے ملتجی کسی آنکھ کا چلو کچھ بھرم نہیں پوچھتے

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہنستے ہنستے اچانک اُٹھیں، چل پڑیں
میز بھی، دوست بھی، شہر بھی چھوڑ دیں

غزل

ترے آنے کا چرچا ہو رہا ہے
نجانے کب سے ایسا ہو رہا ہے

سمٹ جاؤں گا میں لمحوں میں اک دن
مرا ہر خواب پورا ہو رہا ہے

سمندر میں گرا ہے چاند ایسے
کہ ساحل تک اجالا ہو رہا ہے

کسی خاموش دروازے کے پیچھے
مجھے معلوم ہے کیا ہو رہا ہے

نئے پردوں میں سب چہرے پرانے
بدلنے کا تماشہ ہو رہا ہے

قیامت کیا کرے گی اس زمیں پر
قیامت سے زیادہ ہو رہا ہے

ہماری دوستی ہے اُس کے غم سے
سو پانی پر گزارہ ہو رہا ہے

عاصم اعجاز

غزل

دو آنکھوں میں پانی ہے
کیوں اتنی حیرانی ہے

گھر میں جو ہے آئینہ
اُس کی ایک نشانی ہے

جس دریا میں اُترے ہم
اُس میں ہی طغیانی ہے

دنیا سے ہے پیار تجھے
یہ دُنیا تو فانی ہے

کل وہ خاک اُڑاتے تھے،
اب یہ گُل افشانی ہے

دل کی قیمت مت پوچھو
ارزانی ارزانی ہے

مُشکل ہی کے ساتھ میاں
سمجھو اک آسانی ہے

پر ٹُوٹے گا تتلی کا
چُھونا تو نادانی ہے

جس سے دل کا راز کھلا
ہاں وہ مصرع ثانی ہے

رُک جانا اقبالؔ میاں
تازہ نظم سُنانی ہے

تصور اقبال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے بسایا شہر ہمارا
ظلم کی اینٹیں ، جبر کا گارا

غزل

دوا ہے نے کوئی چارہ گری ہے
دعاؤں میں نجانے کیا کمی ہے

جہاں میں نے بہت مدت گزاری
وہی اک شہر مجھ سے اجنبی ہے

بظاہر مسکراتا ہے وہ چہرہ
مگر، آنکھوں میں ٹھہری جو نمی ہے

اسیری سے رہائی ہو مبارک
مگر مشکل بہت یہ زندگی ہے

وہی دنیا سمیٹے پھر رہے ہیں
جو کہتے ہیں یہ دنیا عارضی ہے

اسی پر شہر سارا مر مٹا ہے
تمھارے حُسن میں جو سادگی ہے

زمانے میں دیے بانٹے ہیں جس نے
اُسی کے گھر میں ہرسو تیرگی ہے

سمجھ اب کچھ نہیں آتا ہے شاہد
عجب افسردگی ہے ، بے بسی ہے

شاہد فرید

غزلیں

کبھی جو ملنا حجاب رکھنا
نظر سے جاری خطاب رکھنا

لبوں پہ چپ کے گلاب رکھنا
یہ چہرہ روشن کتاب رکھنا

کبھی نظر سے کبھی سخن سے
یہ ہم پہ دہرا عذاب رکھنا

کسی کو خواہش سے پہلے ملنا
تو حسرتوں کے نصاب رکھنا

محبتوں کا صلہ محبت
یہ مختصر سا حساب رکھنا

عداوتوں کے سوال پر تم
محبتوں کے جواب رکھنا

بشیر احمد حبیب

ساون رت کی پہلی بارش تو اور میں
رجم جہم میں جلنے کی خواہش تو اور میں

بادل برکھا ساون رت کا بھیگا گیت
موسم کی یہ گہری سازش تو اور میں

رات کے پچھلے پہر اک بادل کی چنگھاڑ
اس پر تیز ہوا کی پرسش تو اور میں

اس کے گال پہ رقصاں بوندیں کتنی خوش
میرا دل اور ہجر کی رنجش تو اور میں

بارش کی مدھم خوشبو رخساروں کے پھول
ہونٹوں سے ہونٹوں کی بندش تو اور میں

ان آنکھوں میں کاجل سے اک بھیگی شام
پہلے ہجر کی پہلی کاوش تو اور میں

بارش میں ان ہونٹوں پر اک بھیگا گیت
رک سی گئی تھی خون کی گردش تو اور میں

چھتری میں بارش سے بچنے کی خواہش
ٹپ ٹپ بوندیں ہونٹوں کی لرزش تو اور میں

بارش میں تصویر ہوا دیوانہ پن
وصل کی پہلی پہلی لغزش تو اور میں

غزلیں

پیار بہت اَب کم کرتے ہیں
کب ہے پیار جو ہم کرتے ہیں

ہجر کا موسم آیا یارا
پیار بچشمِ نم کرتے ہیں

کچھ ایسے مصروف ہوئے ہم
پیار بھی اَب بے دم کرتے ہیں

پیار پکارے یار پکارے
پیر مرے چھم چھم کرتے ہیں

پیار میسر جب ہو تو پھر
سامنے اپنے رَم کرتے ہیں

لوٹے گا فاروقؔ سبھی کچھ
آپ بھلا کیوں غم کرتے ہیں

زبیر فاروق

اِس خاطر کچھ لمبی ہم نے اَور کہانی کی
ایک حسیں کا ساتھ تھا خوشبورات کی رانی کی

دردِ ہجر اُبھر آیا تھا میرے سینے میں
ایک وجہ تھی یہ بھی میری اشک روانی کی

محفل کو اِک چپ تھی لگی تھا ہر کوئی خاموش
کون تھا آیا خبریں لے کر رات سہانی کی

ذہن کے اندر ڈیرہ ڈال کے بیٹھ ہی جاتی ہے
یارا یہ تاثیر عجب ہے بات پرانی کی

جس کو دیکھ کے آہیں بھرنے لگا تھا میں فاروقؔ
تھی تو میری ہی پر تھی تصویر جوانی کی

غزل

جُستجُو کے کِسی جہان میں ہے
دِل پرِندہ ابھی اُڑان میں ہے

اُس کا چہرہ ہے اب بھی آنکھوں میں
اُس کی آواز اب بھی کان میں ہے

پاس ہو گا کہ فیل ، کیسے کہوں ؟
دِل محبت کے اِمتحان میں ہے

کاش ہوتی وہ حُکمرانوں میں
ایک خُوبی ، جو باغبان میں ہے

خُوب ہے عِلم کی دُکاں داری
بِک رہا ہے مگر دُکان میں ہے

کر رہے ہیں بہت سے لوگ طواف
کچھ تو ہے جو اُسی مکان میں ہے

سب خُدا کا ہے اِس زمین میں بھی
اور جو کچھ بھی آسمان میں ہے

میرے کِردار کے حوالے سے
بس مِرا نام داستان میں ہے

مِل کا مالِک نہیں سمجھ سکتا
جذبہ محنت کا جو کِسان میں ہے

کیوں ڈرے نفرتوں کی دُھوپ سے وہ
جو محبت کے سائبان میں ہے

مار سکتا ہوں ، مر بھی سکتا ہوں
آخری تیر بس کمان میں ہے

مُجھ پہ طاری ہیں وحشتیں کیفی
خواہشِ وصل جِسم و جان میں ہے

محمود کیفی

غزل

خدا نے سر بہ سر لکھا ہوا تھا
سزا کیسی اگر لکھا ہوا تھا

کہا مجھ سے فرشتوں سا رہوں میں
مجھے لیکن بشر لکھا ہوا تھا

لکھا تھا بیٹیوں کا نام رحمت
اور اس کے ساتھ ڈر لکھا ہوا تھا

تمہارا ہوتے ہوتے رہ گیا میں
تمہارے ساتھ گھر لکھا ہوا تھا

کسی کے بخت میں تھی بادشاہی
کسی کو در بہ در لکھا ہوا تھا

صغیرؔ اس کی تھی منزل اور کوئی
میں اس کی رہگذر لکھا ہوا تھا

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حُسن کو حُسنِ بے رُخی خالد
بے کراں آسماں سے ملتا ہے

غزلیں

حبس ہی حبس ہے ہوا بھی نہیں
اور وہ کھڑکی وہ در کھلا بھی نہیں

وہ مسافت کہ پیر زخمی ہیں
چاک دامن سلا ہوا بھی نہیں

کشتی طوفاں میں گھر گئی میری
اور مرے ساتھ ناخدا بھی نہیں

وقت کے بھی عجیب چکر ہیں
مجھ کو یہ وقت پر ملا بھی نہیں

ماں تو بچپن میں مر گئی میری
اب مرے ساتھ اک دعا بھی نہیں

ہائے! یہ زیست کا سفر کوکی!
کٹ گیا ہے مگر کٹا بھی نہیں

کوکی گل

جانے کیا سوچ کے در گھر کا کھلا رکھا ہے
"اک دیا ہم نے سر راہ جلا رکھا ہے"

اس نے ہی اپنی وفاؤں سے کیا شرمندہ
عشق میں جس کے زمانے کو خفا رکھا ہے

مان تھا جس کی وفاؤں پہ دغا اس نے کی
عشق میں ہم نے یہ صدمہ بھی اٹھا رکھا ہے

دور جا کر بھی وہ کب دور ہوا ہے مجھ سے
دل کے آنگن کو جو یادوں سے سجا رکھا ہے

وقت پڑنے پہ جو منہ موڑ کے چل دیتے ہیں
دوست کیوں ایسوں کو پھر تم نے بنا رکھا ہے

اس کے ظاہر پہ نہ جاؤ کہ ہے دھوکا یکسر
ایک چہرہ پسِ چہرہ بھی چھپا رکھا ہے

نائیلہ راٹھور

غزل

ڈر رہا ہوں نئی آگ سے
جو ہے روشن مری آگ سے

جل رہے ہیں دیے بھی مگر
روشنی ہے تری آگ سے

خاک سے میں بھی پانی ہوا
جونہی نکلی پری آگ سے

میرے لب آج بھی سرخ ہیں
تیرے رخسار کی آگ سے

آگ نفرت کی دل میں لیے
بھاگتے ہیں سبھی آگ سے

آگ سے تیرگی کا وجود
جس طرح روشنی آگ سے

کیا ڈرے آدمی آگ سے
پھول ہوتی ہوئی آگ سے

نقرئی نقرئی روشنی
سرمئی سرمئی آگ سے

سرمدی آگ کیسے ملے
عشق کی سرسری آگ سے

الحذر الحذر الحذر
حسن کی عارضی آگ سے

میری اس شوخ سے دوستی
آب کی دوستی آگ سے

امتیاز انجم

غزل

تامل کر رہا ہوں پھر بھی کوئی شے اُٹھانے میں
اگرچہ سانپ کو دیکھا نہیں میں نے خزانے میں

اے شہزادے غلاموں سے رویہ ٹھیک رکھا کر
ملا دے گا وگرنہ زہر کوئی تیرے کھانے میں

تجھے معلوم ہے سرمایہ داری بڑھ رہی ہے اور
سماجی مرتبہ کتنا ضروری ہے زمانے میں

وہ ڈھلتی عمر میں کیسے کسی کا ظلم سہہ جاتا
گزاری جس نے ہو اپنی جوانی قید خانے میں

تجھے زیبا نہیں میری وفاداری پہ شک کرنا
اگر تاخیر ہوجائے مجھے وعدہ نبھانے میں

ازور شیرازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی کے دکھ ازل سے زندگی کے ساتھ ہیں
لوگ فانی ہیں مگر لوگوں کے دکھ فانی نہیں

غزلیں

ماں جی تمھارے بعد میں سوئی نہیں کبھی
پتھر ہوئی ہے آنکھ یہ روئی نہیں کبھی

تیری دعا کے سائے میں چلتی رہی ہوں میں
تیرا خیال ساتھ ہے کھوئی نہیں کبھی

جس میں تمھاری یاد کا بھی ذائقہ نہ ہو
ایسی تو کوئی یاد پروئی نہیں کبھی

تیرے طفیل اپنے تھے سارے ہی اب تلک
تیرے بنا جہاں میں تو کوئی نہیں کبھی

فرح شاہد

محبتوں میں مجھے تو اداس رہنے دے
جو کچھ نہیں ہے تو یادوں کے پاس رہنے دے

وہ جس جگہ بھی ہے میرا ہے بس وہ میرا ہے
یہ میرے دل میں خدایا قیاس رہنے دے

میں تیرے در کی ہوں باندی سنبھال کر رکھنا
کہ در سے دور نہ کرنا تو پاس رہنے دے

میں اس کی پیاس کو سمجھی ہوں اسکی آنکھوں سے
وہ کاش ایسے ہی اپنی یہ پیاس رہنے دے

غزلیں

وہ مصلحت کی حویلی کا اک مکین مجھے
ولاتا رہتا ہے سچ کا بہت یقین مجھے

ہر ایک بات میں کرتے ہو طنز بھی شامل
ہر ایک بات پہ کہتے ہو نکتہ چین مجھے

کیا ہے جب سے تعین خود اپنی قیمت کا
میں ان کو کوستا رہتا ہوں صارفین مجھے

میں آسماں سے اسے گھر سمجھ کے تکتا رہا
ستارہ زاد سمجھتی رہی زمین مجھے

سبق جو یاد کرایا تھا تجھ کو یاد ہے کیا؟
کہ پھر چڑھانی پڑے گی یہ آستین مجھے

عدنان خالد

وہ ہم کو عشق میں ایسا نڈھال کر دے گا
کہ حوصلہ ہمیں کاسے میں ڈال کر دے گا

کھرچتے وقت اسے میں نے یہ نہیں سوچا
پرانا زخم نئی شرٹ لال کر دے گا

وہ اپنے جسم کے خلیوں سے یوں کرے گا بات
لپٹ کے مجھ سے تکلم بحال کر دے گا

میں جانتا ہوں کہ برباد ہونے کا موقع
وہ اپنے آپ سے مجھ کو نکال کر دے گا

میں اس کے سامنے آیا تو لازماً عدنان
وہ لاجواب سا کوئی سوال کر دے گا

غزل

بس اتنا چاہتی ہوں وصل کی اک رات حاصل ہو
مری آنکھوں کو تیرے نور کی سوغات حاصل ہو

مرے اندر جو رہتا ہے مخاطب ہو کبھی مجھ سے
اکیلی چل رہی ہوں میں کسی کا ساتھ حاصل ہو

میں تیاگی ہوں مرے اندر کوئی ارماں نہیں باقی
بجز اس کے کہ قربِ اصل موجودات حاصل ہو

میں اپنے آپ میں رہتی ہوں خود کو جانتی کب ہوں
پتہ کچھ تو چلے کچھ تو سراغِ ذات حاصل ہو

حیات و موت کے چکر سے چھٹکارا نہیں مشکل
اگر کچھ طاقتِ تبدیلیِ اوقات حاصل ہو

زمینوں کے حجر، حیواں، شجر باتیں کریں مجھ سے
مجھے ادراکِ احساساتِ مخلوقات حاصل ہو

رفعت وحید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھ کب جھپکے گی، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں
اے مرے خوابِ رواں! ہے تری تعبیر کہاں

غزل

کچھ دن چھاتی بھیتر رکھ کر دیکھو تو کچھ روگ میاں
پھر خود ہی پتہ لگ جائے گا، کیوں لیتے ہیں جوگ میاں

کب یہ دنیا روک سکی ہے رستہ ٹھنڈی چھاؤں کا
دیواروں سے اُگ آتے ہیں پیپل جیسے لوگ میاں

سُکھ چھایا کے یار زمانے وقت کا گبند چھوڑ گئے
اب مانس کو مانس کھائے، دھرتی اُگلے سوگ میاں

پیت نگر کے کانٹوں کو، ان جلتے بلتے چھالوں کو
پھول اور تارہ جس نے جانا، انت ملا سنجوگ میاں

ریت پہ انگلی پھیری بابر، اک مُورت سی آپ بنی
اب رقص بگولے کرتے ہیں، دیوانوں کو بھوگ میاں

احمد سجاد بابر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے بے گنہی تو مرے ہمراہ چلے گی
سر لے کے بھی الزام نہ اترے مرے سر سے

غزلیں

فکر و شعر و بیان میں آیا
ایک بس تُو ہی دھیان میں آیا

نخل مایوس ہونے والا تھا
ابر جب آسمان میں آیا

دل میں کتنے چراغ جل اٹھے
کون میرے مکان میں آیا

اب کہانی بدلنے والی ہے
تُو مری داستان میں آیا

جس کا کوئی جواب ہی نہ بنے
وہ سوال امتحان میں آیا

گھونسلہ اُس کو دیکھتا ہو گا
جب پرندہ اڑان میں آیا

مجھ پہ برگد نے کھول دی شاخیں
اور میں سائبان میں آیا

وسیم جبران

منہ پہ سورج نے خوں ملا ہوا تھا
مجھ سے جس شام وہ جدا ہوا تھا

مجھ کو بس تُو دکھائی دیتا تھا
ایسا جادو ترا چلا ہوا تھا

میرا غصہ شدید تھا لیکن
تُو بھی حد سے ذرا بڑھا ہوا تھا

پھر مری جیت تو یقینی تھی
تُو مرے ساتھ جب کھڑا ہوا تھا

ایک بھونچال سے ذرا پہلے
اک پہاڑی پہ گھر بنا ہوا تھا

میری آنکھیں چھلکتی جاتی تھیں
دل محبت سے جب بھرا ہوا تھا

ہم سفر میں رہے سدا جبرانؔ
راستا پاؤں میں پڑا ہوا تھا

غزلیں

سوچنا بھی محال ہے یارو
اُس کو میرا خیال ہے یارو

کیا مجھے وہ بھی یاد کرتا ہے
اِس کا اب کیا سوال ہے یارو

وہ رہے خوش مگر ہمارے لیے
زندگی کیا، وبال ہے یارو

اپنی راہوں پہ لا کے چھوڑ گیا
یہ بھی اُس کا کمال ہے یارو

درد بھی اُس نے بے مثال دیئے
وہ جو اپنی مثال ہے یارو

راجہ عبدالقیوم

مفہوم جب تک اُن سے گھمایا نہیں گیا
باتوں میں اُن کی ہم سے بھی آیا نہیں گیا

نشوونما ہو کیسے ہمارے وجود کی
ہم سے ترا فریب بھی کھایا نہیں گیا

خود آ گیا تو اس لیے رکھنا پڑا اِسے
یہ شعر کھینچ تان کے لایا نہیں گیا

پایا نہیں گیا جو رہا ہم کو دستیاب
اور گم ہوا تو ہم سے گنوایا نہیں گیا

یاروں کی بے رُخی ہے یقیناً عروج پر
کب سے مرا مذاق اُڑایا نہیں گیا

رضی رضوی

غزلیں

یہی تو سوچ کے ہلکان تھا میں سارا دن
کہ میرے بعد بھی کٹتا رہا تمہارا دن

مجھے پتہ ہے ترا فلسفہ ضرورت ہے
اسی لیے تو مرے بعد بھی گزارا دن

ہم آج شام سے پہلے نہ لوٹ پائیں گے
کہاں یہ لمبا سفر اور، کہاں ہمارا دن

ہم اہل ہجر ہیں راتوں کو جاگنے والے
ہمارے واسطے تو نے نہیں اتارا دن

ہمیں بھی وصل کے لمحے عزیز ہیں، جاناں!
ہمیں بھی زندگی سے دے کوئی ادھارا دن

حسین لگنے لگی ہے تمام دنیا مجھے
تمہاری آنکھ نے ایسے مرا سنوارا دن

عمران اعوان

مشکل سہی وجود سے باہر نکل کے آ
زندان کی حدود سے باہر نکل کے آ

مجھ پر یہ لفظ ہُو بھی ابھی تک نہیں کھلا
واعظ ذرا سجود سے باہر نکل کے آ

پہنے ہوئے ہیں سب نے یہاں پر سیہ لباس
مطرب تو اب سرود سے باہر نکل کے آ

کرتا ہے خود کو کس لیے روپوش سائیاں
اک بار اس جمود سے باہر نکل کے آ

حرسا مقام تجھ کو ملے گا اے جنگجو
باطل کے تو جنود سے باہر نکل کے آ

اسدرضا سحر

غزل

نام سن کر آنکھ میں اک رنگ بھر جاتا شہاب
پانیوں پر عکس سا پھر تیر جاتا تھا شہاب

اس کے ہونٹوں پر تبسم میرے شعلوں کی طرح
جس نے مجھ کو آسماں سے ٹوٹتے دیکھا شہاب

چونک جاتا تھا میں اکثر دیکھ کر اس شخص کو
نام تیرا سن کے گہرا سانس جو لیتا شہاب

وہ ملا جب راستے میں اجنبی بن کر ملا
کاش! میری روح کو پہچانتا میرا شہاب

بات کرتے کرتے اس کے لفظ بھی رونے لگے
آنسوؤں میں بھیگتا دیکھا گیا لہجہ شہاب

تھی شراب چشم ہی مہنگی جہاں عاشق گئے
خون دل بازار میں بکتا رہا سستا شہاب

ہم رہے پیاسے، ہماری سوچ بھی پیاسی رہی
ہم جہاں رہتے تھے بہتا تھا وہاں دریا شہاب

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور سمجھانے لگا
میں نے دیکھا تو تھا وہ رستہ ترے گھر کا شہاب

شہاب اللہ شہاب

غزل

سپاسِ بندگاں ابھی
ادا کرو میاں ابھی

گرا ہی چاہتا ہے کیا
سروں پہ آسماں ابھی

ترس نہ مجھ پہ کھایئے
خلوصِ دوستاں ابھی

یہ اختیار جبر ہے
کھڑا ہوں میں جہاں ابھی

جبینِ عجز پہ مرا
ہے داغ کا نشاں ابھی

پڑا رہے یہ نور سا
حجاب درمیاں ابھی

نہ ڈال اس پہ بارِ عشق
یہ دل ہے ناتواں ابھی

جھنجھوڑتا ہوں وقت کو
وہ بوڑھا میں جواں ابھی

میں سُن رہا ہوں اَن سُنی
سُنی سی داستاں ابھی

اُڑی ہیں اُن لبوں سے دو
وہ شوخ تتلیاں ابھی

چُرا نہ آنکھ ساقیا
بھرا ہے دل کہاں ابھی

گزر گئی ہے جان سے
برات عاشقاں ابھی

ہے عارضِ جمال پر
نگاہ دلستاں ابھی

سرفراز عارض

غزلیں

تابندہ ترے دل میں اگر پیار رہے گا
چہرے پہ تبسم تو مرے یار رہے گا

جس دل میں محبت نہیں موجود ہے یارو
وہ دل تو ہمیشہ سے ہی بے کار رہے گا

جس درد کا حل کوئی بھی کر پایا نہیں ہے
اس درد کا حل تیرا ہی دیدار رہے گا

وہ دن تو مرے یار نہیں عید سے اب کم
جب لب پہ ترے پیار کا اظہار رہے گا

ہر دل نہیں واقف ترے غم سے مرے ہمدم
یہ دل ترے غم میں مرے سرکار رہے گا

تو لاکھ ستم کر لے مگر پھر بھی مری جاں
دل تیری محبت میں گرفتار رہے گا

اک بار وہ گر آئیں مرے شہر میں طلحہ
ہر تنکا مرے شہر کا سرشار رہے گا

طلحہ بن زاہد

بظاہر تو تیرا وفادار ہوں میں
مگر زندگی تجھ سے بیزار ہوں میں

میسر نہیں ہے کوئی راہِ رخصت
یہ کیسے قفس میں گرفتار ہوں میں

ترا چھوڑ جانا ضروری تھا مجھ کو
مری جان! وحشت کا بازار ہوں میں

قبیلے کے رستے پہ مردہ پڑا ہے
وہ جو کہہ رہا تھا کہ سردار ہوں میں

عدالت میں لے آئے کچھ دوست مجھ کو
سمجھتے ہیں ان کا طرفدار ہوں میں

میسر نہ ہو جس سے سایہ کسی کو
کڑی دھوپ میں ایسی دیوار ہوں میں

کہیں سن کے سارب وہ مر ہی نہ جائے
اسے مت بتاؤ کہ بیمار ہوں میں

مزمل رضا سارب

جہاں بھی دیکھوں نیا اک جہاں نکلتا ہے

شاعرِ امروز

قمر عباس

شاہد ماکلی

قمر عباس کے مجموعہء خیال کی ورق گردانی شروع کر دیں تو آپ اختتام تک پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ ایک ایک صفحے پر کئی کئی اچھے اشعار ملیں گے جو آپ کے دل میں اترتے چلے جائیں گے اور آپ ان اشعار کو اپنی بیاضِ دل میں منتخب کرتے ہوئے اگلے صفحات تک پہنچ جائیں گے۔ قمر عباس کے ہاں لفظ کی مرکزیت کا معنوی ادراک لائقِ ستائش ہے۔ لفظ کی بنیاد پر تلازماتی نظام قائم کر کے معنی پیدا کرنے کی صلاحیت ان کے لسانی اور تنقیدی شعور کی غماز ہے۔ لفظ کے تخلیقی استعمال، جدید حسیات دانی اور رنگا رنگ موضوعات کی نقش آرائی نے ان کے شعری کینوس کو جاذب نظر اور پُر امکان بنا دیا ہے۔

وہ 14 اگست 1980ء کو کہوٹہ میں پیدا ہوئے۔ خطاط ہیں اور کہوٹہ کے ادبی حلقے میں خاصے فعّال ہیں۔ ان کا مختصر سا شعری انتخاب نیچے دیا جا رہا ہے:

میں دیکھتا ہی نہیں غور سے اگر دیکھوں
جہاں بھی دیکھوں نیا اک جہاں نکلتا ہے

جو اپنی چھت سے اتر کر گیا ہے کمرے میں
وہ ایک شخص مرے دل سے کیوں اترتا نہیں

ہمیشہ ٹوٹ کے گرتا ہے آسمانوں سے
کہ یہ ستارا کبھی جوں کا توں اترتا نہیں

پاکیزگی کا درس دیا اس نے شہر میں
گاہک مری دکان پہ صابن کے بڑھ گئے

خوشبو نے ایسے ناک میں دم ہے کیا ہوا
جیسے ہوا میں ڈھیر تعفّن کے بڑھ گئے

مولا اب اس وبا کا تسلسل نہیں رہے
گھل مل کے رہنے والے بھی مل جل نہیں رہے

وہ چاہتا ہے رابطہ مجھ سے نہ ہو سکے
سڑکوں کے آر پار کوئی پل نہیں رہے

مرا پھر شہر میں دل لگ گیا تھا
وہاں مجھ کو مضافاتی ملے تھے

زندگی قرض ہے بنیے کا، اترتا ہی نہیں
جو کماتا ہوں رقم، سود میں لگ جاتی ہے

جب مرے چاروں طرف کوئی بھی موجود نہ ہو
پھر مری حاضری موجود میں لگ جاتی ہے

بات میری اسے گولی کی طرح لگتی ہے
اس کا مطلب ہے کہ اچھا ہے نشانہ میرا

مرے یقین کی پریوں کو چھیڑنے آیا
اندھیری رات میں اک بھوت بدگمانی کا

تو نے جو کل کہی تھی مجھے پیٹھ پھیر کر
وہ بات سہہ گیا ہوں جو کوڑے سے کم نہیں

☆☆☆☆☆

ہمارے چلنے سے رستے طویل ہوتے گئے

شاعرِ امروز
مبین دھریجو

شاہد ماکلی

مبین دھریجو کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے ہماری ملاقات ایک ایسے حوصلہ مند انسان سے ہوتی ہے جو اپنے انتشار کو نظم کرنے کی تگ ودو میں ہے؛ جو اپنے بکھراؤ کو سمیٹنے کی کاوش میں ہے؛ جو اپنے پھیلاؤ کو ایک نقطے پر مرتکز کرنے کی کوشش میں ہے۔ اس کشاکش میں مبین دھریجو کئی بار ٹوٹتے ہیں اور ہر بار خود کو نئے سرے سے جوڑتے ہیں۔ کئی بار بکھرتے ہیں اور ہر بار اپنے اجزائے پریشاں کی شیرازہ بندی کرتے ہیں، حوصلہ نہیں ہارتے۔ ہر بار ایک نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ ان قوتوں کے آگے کھڑے ہو جاتے ہیں جو ان کے راستے میں بار بار حائل ہوتی ہیں۔ یہ خارجی قوتیں ہر بار چہرہ بدل بدل کر ان کے سامنے آتی ہیں؛ کبھی افسردگی کی شکل میں، کبھی غم کی صورت میں، کبھی بے دلی کے روپ میں، کبھی رائیگانی کے رنگ میں، کبھی اداسی کے لبادے میں اور کبھی خوف کے بھیس میں۔ ان ساری صورتوں کا عرفان ان کی متنی وسعت پذیری میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔

مبین دھریجو کا تعلق خانپور سے ہے۔ 2019ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ذیل میں ان کا نمونہء اشعار:

خدا نے کچھ بھی مکمل نہیں دیا ہم کو
ہمیں تو غم بھی ضرورت سے کم میسر ہے

مرا وجود مقیّد ہے ایک دائرے میں
مجھے مدار کے اندر کا غم میسّر ہے

چُپ چاپ آسماں کی طرف دیکھتا ہوں میں
یہ کون مجھ فقیر سے کاسہ بدل گیا

ارے نہیں! تُو ہمیں دوستوں میں ہنستا دیکھ
اداس لوگ تو بس نام کے بنے ہوئے ہیں

بڑے ہی زور سے چیخا کوئی خلافِ عمل
وہ جس کا کام مسلسل خموش رہنا تھا

کوئی شعلہ بیاں بھی کر نہ پائے
جو تم خاموش رہ کر کر رہی ہو

بے دلی کا قفل میرے دل پہ ہے اک عمر سے
دستکیں دیتے ہوئے لوگوں کو اندازہ نہیں

کچھ بھی مت پوچھ کہ لب کانپ رہے ہیں میرے
ایسی حالت ہے کہ بولا نہیں جانا مجھ سے

منتشر ہو گئی مجھ کو وہ اکٹھا کرتے
اتنا بکھراؤ تھا مجھ میں کہ سمیٹا نہ گیا

طویل تھے نہیں، جتنے طویل ہوتے گئے
ہمارے چلنے سے رستے طویل ہوتے گئے

ہماری مشکلیں بڑھتی گئیں اور اس کے ساتھ
ہماری ماؤں کے سجدے طویل ہوتے گئے

موت کی رہگزر بناتی ہے
زندگی اپنا ڈر بناتی ہے

☆☆☆☆☆

داڑھ نکلوانے کی کہانی [طنز و مزاح]

سیدہ آمنہ ریاض

ایک دفعہ کا ذکر ہے بلکہ بہت دفعہ کا ذکر ہے کہ داڑھ میں تکلیف شروع ہوئی جس کا بروقت علاج کروایا گیا۔ لیکن یہ تکلیف پھر چھڑتی گئی اور ساتھ ساتھ مجھے بھی چھیڑتی گئی۔ پہلے تو میں نے خاص لفٹ نہیں کرائی لیکن جب درد حد سے بڑھنے لگا اور میری جان پہ بن آئی تو ساتھ ہی ڈاکٹر کی یاد بھی آئی۔

فوراً ڈاکٹر کو فون لگایا اور ساتھ ہی دھمکی بھی لگا دی کہ اگر میں اس تکلیف ذلیلہ سے مرگئی تو آپ کا نام لے کر مروں گی۔ ڈاکٹر بیچارہ انتہائی شریف النفس ثابت ہوا اور مجھے فوراً اپوائنٹمنٹ دیتے ہوئے یہ کہنے کی کوشش کی کہ کتھے ہور جا کے مریا فیر پراں مر۔

خیر خدا خدا کر کے ڈاکٹر کے کلینک پہنچی تو پہنچتے ہی میری باری آ گئی۔ تکلیف کی شدت اتنی تھی کہ جاتے ہی منہ سے نکلا کہ ڈاکٹر صاحب میرے سارے دند کڈھ دیو۔ یہ سننا تھا کہ ڈاکٹر خود اپنے ہی دند کڈھ کے وخانے لگا۔ پھر مجھے ایک برقی کرسی پر بڑھا دیا گیا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو حکم صادر فرمایا کہ بکرا ذبح کرنے والی بڑی اور تیز چھری لے آو۔ جس پر میرے اوسان خطا ہوگئے، زمین

آسمان گھومتے نظر آئے اور میں نے ڈاکٹر صاحب کی جانب دیکھا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب شکل سے میں جتنی بہادر اور امیر لگتی ہوں اصل میں اتنی بالکل نہیں ہوں۔ جس پر ڈاکٹر نے کہا کہ اپنا منہ بند رکھیں میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس جواب پر سوائے شرمندہ ہونے کے میں کچھ بھی نہ کہہ سکی اور چپ چاپ منہ بند کر لیا تاکہ مزید بے عزتی نہ ہو۔

پھر ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو کہا کہ وہ والا ٹیکا لاؤ جو بھینسوں کو لگاتے ہیں۔ میں نے جواباً پکا منہ بناتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ سارے ٹیکے آج ہی منگوائیں میں وی اتھے ای آں--- ساتھ ہی دل کیا کہ اس سے پہلے کہ ٹیکا آئے ایتھوں فوراً بچ جاواں۔

ڈاکٹر نے یکے بعد دیگرے چار ٹیکے میرے منہ میں ٹھوک دیئے۔ البتہ یہ پتہ نہ چل سکا کہ بھینسوں والا ٹیکہ کون سا تھا اور بکرے والا کونسا؟ ہر ٹیکے پر--- اوہ--- آہ--- آوچ--- کی آوازیں میرے حلق سے نکلتی رہیں جس پر ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کو بالکل درد نہیں ہو رہی۔ شوخیاں مارنا بند کریں۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ جو جو کچھ کر رہے ہیں اس کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ مجھے دیں۔ اس کے بعد مجھے پندرہ منٹ انتظار کرنے کا کہا گیا تاکہ ٹیکہ اپنا اثر دکھا دے اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا یعنی ٹیکے نے اپنا اثر دکھا دیا اور میرا منہ سن ہو گیا۔

پھر ڈاکٹر نے میرے منہ میں جانے کون کون سے خطرناک اوزار بکواسیہ ڈال کر میری داڑھ کے ساتھ زور زبردستی شروع کر دی اور بالآخر تمام آلات کے باوجود انگشت شہادت سے داڑھ نکال کر باقاعدہ روئی میں ریپ کر کے میرے سیدھے ہاتھ میں تھما دی کہ لے لو جی اپنی جنی گل سی۔ چونکہ منہ سن تھا اس لیے دل میں میں یہی کہہ سکی کہ فیر اپنی جنی گل دے پیسے دی کی لینے۔ لیکن بہرحال ڈاکٹر کی کاریگری کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔ ساتھ ہی میرے ہاتھ میں وہ پرچہ پکڑا دیا گیا جس پر داڑھ نکلوانے کے بعد کی احتیاطیں اور شرائط درج تھیں۔ جس پر درج ایک ہدایت پر مجھے شدید اختلاف تھا کہ چوبیس گھنٹے تک کچھ نہیں کھانا۔ عین اسی وقت مجھے دنیا جہان کے تمام کھانوں کی یادیں اٹھ اٹھ کے آنے لگیں۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے لیکن یہاں تو داڑھ بھی کھو دی اور چوبیس گھنٹے تک کے لیے کھانا بھی کھو دیا۔

چوبیس گھنٹے بعد طبیعت بحال ہوئی تو سوچا کہ جو ہوا اچھا ہوا کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے کچھ چیزوں کا کھونا بہت کچھ پانے کے لیے ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆

سخن گوئی اور سخن شناسی

اُردو ادب کی جان پہچانی قد آور شخصیت، مشہور انشا پرداز اور مؤقر رسالے ماہ نامہ نگار کے ایڈیٹر علامہ نیاز فتح پوری رقم طراز ہیں۔

''یہ امر مُسلّم ہے کہ سخن گو ہونا اور چیز ہے، اور سخن فہم ہونا دوسری۔ یعنی ممکن ہے کہ ایک شاعر خوش فکر ہو اور خوش فہم نہ ہو۔ اس طرف سب سے پہلے میرا ذہن منتقل ہوا جب میں نے میر کا خود انتخاب کیا ہوا کلام دیکھا۔ میر اس لحاظ سے کہ وہ بہت سے نشتر رکھنے والے دیوان کا خالق ہے یقیناً خدائے سخن ہے لیکن جب میں نے خود اس کا انتخاب دیکھا تو مجھے شعر فہمیٔ عالمِ بالا کی طرف سے سخت مایوسی ہوئی۔

(ماہ نامہ نگار جنوری/فروری 1941)

غالب کے بارے میں بھی ہم جانتے ہیں کہ بیدل کے رنگ اور اس کے تتبع میں سینکڑوں نا قابلِ فہم اور بے کار غزلیں کہنے کے بعد غالب کو پتہ چلا، بلکہ اُنھیں بتایا اور سمجھایا گیا کہ وہ پندرہ بیس سال ایسا کلام لکھتے رہے ہیں جس کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دینا ہی بہتر ہے۔ غالب کو اپنی سخن فہمی پر اعتبار ہی نہ رہا۔ اُنھوں نے اپنے انتخاب کلام کا کام اپنے دوست مولوی فضل حق کے سپرد کر دیا۔ اب غالب کا جو مروجہ دیوان ہے، جو بلاشبہ غالب کا ہے مثل شاعرانہ عظمت کا شہکار ہے اور جسے ہم بجا طور پر حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں، مبینہ طور پر مولوی فضل حق کا ہی انتخاب کردہ ہے مگر اس میں غالب کے بعض شہکار اشعار شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ مثلاً اس شعر کو انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

.....

اور حیرت ہے کہ اسی غزل کے یہ کمزور اور بھرتی کے اشعار انتخاب میں شامل کر لیے گئے:

کہتے ہیں نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا
حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا

.....

ایک دفعہ میں حضرت سید عبدالحمید عدم کی

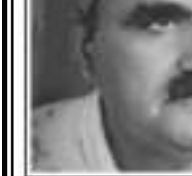

جمیل یوسف

خدمت میں حاضر تھا باتوں باتوں میں غالب کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے۔ اچھا، وہی غالب جس کے دیوان کا پہلا شعر ہی بے معنی ہے میں نے عرض کیا۔ آپ اس مشہور شعر کی بات کر رہے ہیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

....

فرمایا: جی ہاں۔ میں نے کہا ”حضور! آپ اسے بے معنی کہہ رہے ہیں۔ اس شعر کی تشریح اور وضاحت میں تو شارحین نے کئی صفحے کالے کر دیے ہیں۔

عدم نے فرمایا ”جمیل ہم فلسفے، ریاضی یا سائنس کی بات کر رہے ہیں یا شاعری کی۔ کیا شعر کی تشریح میں صفحے کالے کرنے پڑتے ہیں۔ شعر تو وہ ہوا ہے جو سنتے ہی دل میں اتر جائے اسی لیے ایک اچھے شعر کی تعریف میں کہا گیا ہے۔ ”از دل خیزد بر دل ریزد“ کیا آپ نے حسرت کا یہ شعر نہیں پڑھا:

شعر دراصل ہے وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائے

....

میں نے عرض کیا: ”جی ہاں۔ غالب نے بھی کہاں ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

....

عدم صاحب ترنگ میں تھے کہنے لگے۔ ”یہ اُس نے اپنے شعر کے بارے میں نہیں کہا کسی کی تقریر کے بارے میں کہا ہے۔“

بات عدم کی طرف نکل گئی۔ میں نے یہ کہنا چا رہا تھا کہ اب بھی دیوان غالب میں بیسیوں ایسے اشعار موجود ہیں جو اس قابل نہیں کہ غالب کے منتخب کلام میں جگہ پاتے۔ وہ ریشم کے تھان میں ٹاٹ کے پیوند معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا اس طرح کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ اس طرح کے تین اشعار تو اوپر بھی درج ہو چکے ہیں:

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

ہوائے سیرِ گل آئینہ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بہ وقتِ سفر انگشت

بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بے تابی
ہزار آئنہ دل باندھے ہے، بالِ یک تپیدن پر

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزہ خط سے
لگاوے خانہ آئینہ میں روئے نگار آتش

فروغ حسن سے ہوتی ہے حل مشکل عاشق
نہ نکلے شمع کے پا، نوالے گر نہ خار آتش

جادہ رہ خور کہ وقت شام ہے تار شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہ نو سے آغوش وداع

(صفحہ ایک سے 59 تک دیوان غالب بہ تحقیق وترتیب مولانا حامد علی خاں)

یہ نسخہ جس سے مندرجہ بالا اشعار لیے گئے ہیں، کل 214 صفحات پر مشتمل ہے گویا اگر پورے دیوان سے اس طرح کے بعید از قیاس، تجلک، مبہم اور حقیقت یہ ہے کہ بے معنی اشعار نکالے جائیں، تو ان کی تعداد دو سو سے یقیناً تجاوز کر جائے گی۔ میں حیران ہوں یہ جھاڑ جھنکار آج تک کسی نے دیوان غالب سے نکال باہر کیوں نہیں کی۔ ایسے اشعار تو ردی کی ٹوکری میں پھینک دینے کے قابل ہیں۔ ان میں اکثر اشعار ایسے ہیں جو نہ فارسی میں ہیں نہ اردو میں زبان کا ایک عجیب چیستان ہے، جس میں یہ لکھے گئے ہیں۔

یہ حال ہے غالب اور مولوی فضل حق جیسے دوستوں کی سخن فہمی کا۔ میں سمجھتا ہوں دیوان غالب کا انتخاب ہونا چاہیے۔ انتخاب صرف ان شعروں پر مشتمل ہو جو ایک اہل ذوق قاری کو آسانی سے سمجھ آسکیں۔ سچی بات یہ ہے کہ غالب کی شاعرانہ عظمت کا انحصار انہی اشعار پر ہے جو آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں اور جن پر خود غالب کا اپنا یہ شعر صادق آتا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

....

اگر میر تقی میر کے ایسے اشعار کو شمار کیا جائے تو ناقابل اشاعت ہیں اور جو میر کے کلام میں ہرگز جگہ پانے کے مستحق نہیں ہیں تو ان کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچے گی۔ میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ”بلندش بلند تر و پستش پست تریں۔“ مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے باکمال اور عظیم شاعری کو پست بلکہ پست تریں اشعار کہنے کی اور پھر اپنے کلام میں شامل کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ اس کی ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان میں سخن گوئی کا ملکہ تو بدرجہ اتم تھا مگر سخن فہمی نہیں تھی۔ یا کم از کم اس درجے کی سخن فہمی نہیں تھی جس درجے کی سخن گوئی کا ملکہ ان میں تھا کوئی نہ کوئی ایسی وجہ ضرور ہے ورنہ وہ اپنے کلام کے دامن میں چند ایک پھولوں کے ساتھ ڈھیر سارا گھاس

پھوس کیوں جمع کرتے۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ میر کے ہاں 71 نشتر ہیں۔ یعنی ان کے کلام میں صرف 71 اشعار ایسے ہیں جو بہترین ہیں۔ پھر اہلِ نقد ونظر نے یہ بھی کہا ہے کہ میر کا کلام ایسا ہے کہ ہر اہلِ ذوق اس میں سے اپنی پسند کے 71 نشتر نکال سکتا ہے۔ اگر یہ بات بھی درست مان لی جائے تو پھر بھی میر کے ہزاروں اشعار میں نشتروں کی تعداد دو تین سو سے زیادہ نہیں بنے گی۔

ناسخ کی قادر الکلامی کا بڑا چرچا تھا۔ زبان و بیان پر ان کی قدرت بے مثل تھی، اسی لیے میر انیس جیسے شاعر نے ان کی شاگردی اختیار کی تھی مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ خود ناسخ کا 95 فیصد کلام منسوخ کر دیے جانے کے قابل ہے۔

حکیم مومن خان مومن کے بارے میں بھی بھی یہی رائے رکھتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ اگر ترنگ میں آکر میرزا غالب یہ نہ کہہ دیتے کہ مومن اپنا یہ شعر مجھے دے دے اور میرا سارا دیوان لے لے۔ وہ شعر ہے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

....

تو ممکن کو وہ مقام نہ ملتا جو ان کو تاریخ شعرو سخن میں حاصل ہوا۔ مومن کے اس عام سے شعر پر اس قدر لوٹ پوٹ ہو جانا کہ اس ایک شعر کے بدلے میں اپنا سارا دیوان دینے پر تیار ہو جانا یہی ظاہر کرتا ہے کہ غالب میں سخن فہمی نہیں تھی۔

فیض احمد فیض نے اپنے آخری مجموعے میں اپنا پنجابی کا جو کلام شامل کیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں بھی اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ان کا پنجابی کلام ان کے اردو کلام کے مقابلے میں کتنا پست ہے اور ناقابلِ اشاعت ہے۔ شاید یہ کلام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کو نہیں دکھایا گیا۔

بڑے شاعروں میں صرف اقبال کو ہی جتنا بڑا سخن گو پایا اتنا ہی بڑا سخن فہم، جو کلام انھوں نے خود منتخب کر کے کتابی صورت میں شائع کروایا، اس میں شاید ہی کوئی ایسا شعر ہو جو کمزور یا غیر معیاری ہو، بلکہ میں کہوں گا جو لطفِ بیان سے خالی ہو۔

ہمارے اپنے عہد میں جناب ظفر اقبال جیسا بڑا شاعر جو بلاشبہ سخن گو بھی ہیں اور سخن فہم بھی، جان بوجھ کر ایسی غزلیں کہہ رہے ہیں جن پر ادبی حلقے انگلیاں اُٹھاتے ہیں میرا خیال ہے یہ کام ظفر اقبال شاید کسی منصوبے کے تحت کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ شاعروں کی نئی نسل کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال نئی نسل کے شاعروں کے لیے ان کا تتبع یا تقلید آسان نہیں ان شاعروں میں لفظ کو برتنے کا وہ ہنر کہاں جو ظفر اقبال کے اوٹ پٹانگ قسم کے شعروں سے بھی مترشح ہے۔

احمد فراز کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ فراز صاحب جتنے اچھے شاعر تھے اُس سے کہیں بہتر شعر شناس اور سخن فہم تھے۔ کبھی کوئی نامانوس ادق لفظ اپنے شعر میں نہیں آنے دیتے تھے۔ موزوں لفظ کا موزوں استعمال اُن کے ہم عصروں میں اُن سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

لاہور

محمد ارشاد

یونیسکو نے لاہور کو ستائیسواں شہرِ ادب قرار دیا ہے۔ خوشی کی خبر ہے۔ 'بیاض' نے پہل کی اور لاہور شہر ادب نمبر شائع کر کے اولیت حاصل کی جو ایک اعزاز ہے۔ امید تھی کہ یہ نمبر لاہور کے شایانِ شان ہوگا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ قصور مجلس ادارت کا نہیں۔ کُلُّ اِناءٍ یَتَرَشَّحُ مافیہِ، برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے ادارے کو جو مل پایا چھاپ دیا۔ اس حال میں بھی پورا نمبر پڑھنے کے لائق ہے۔ جناب امجد اسلام امجد کی تحریر سے معلوم ہوا کہ لاہور کے لیے اس اعزاز کا حصول جرمنی کے پاکستانی نژاد پارلیمنٹرین وسیم بٹ کے سر ہے۔ خدا وسیم بٹ کو جزائے خیر دے۔ کوئی شہر یا ملک، اپنے آپ کو اس اعزاز کے لیے تجویز نہیں کر سکتا۔ ''اس کے لیے کسی دوسرے ممبر ملک یا شہر کو اس کا نام تجویز کرنا پڑتا ہے۔...... لاہور کے کیس میں یہ شہر وہی ہائیڈلبرگ ہے، جس کے دریائے نیکر کے کنارے اقبال نے اپنی مشہور نظم تخلیق کی تھی۔'' چلو اتنا تو ہوا یونیسکو سے منوا تو لیا گیا کہ لاہور ستائیسواں سہی دنیا کے شہر ہائے ادب میں سے ایک ہے۔ پہلے چھبیس کون کون سے ہیں اس کا تو علم نہیں۔ زیادہ تعداد مغرب کے شہروں کی ہوگی۔ لاہور ستائیسواں کیوں

پہلے پانچ سات میں کیوں نہیں کہ یہ ایک ہزار سال پہلے بھی شہر ادب تھا، جب مغرب کے باسی غاروں میں رہتے تھے سوائے یونان وروما کے باسیوں کے۔ ہزار سال پہلے بھی لاہور کے باسیوں میں مسعود سعد سلمان لاہوری (۴۳۸-۵۱۵ھ) کے علاوہ بھی کئی مشاہیر اہلِ علم وادب موجود تھے۔ مسعود سعد سلمان کا مولد ہمدان تھا لیکن منشا، ومسکن لاہور اور اپنے آپ کو ہمدانی نہیں لاہوری کہتا تھا اور فارسی ادب کی تاریخ میں مسعود سعد سلمان لاہوری کے نام سے معروف ومشہور۔ اپنے آپ کو فرزند لاہور کہتا تھا۔ فارسی شاعری کے قدیم ترین تذکرے لباب الالباب (تالیف ۶۱۸ھ) کے مؤلف محمد عوفی نے اسے تین زبانوں فارسی، عربی اور ہندوی میں صاحب دواوین بتایا ہے۔ آج صرف فارسی دیوان دستیاب ہے۔ ہندوی سے مراد پنجابی زبان ہی ہوسکتی ہے نہ کہ برصغیر میں بولی جانے والی کوئی دوسری زبان۔ اس خطہ کا نام پنجاب (پنج آب، جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج) اکبر بادشاہ کے دور میں پڑا اور یہاں کی زبان بھی پنجابی کہلائی۔ قبل ازیں اس کو خطہ لاہور کہا جاتا تھا۔ لباب الالباب میں پنجاب اور پنجابی کے الفاظ موجود نہیں لیکن یہ خطہ اور یہاں کی زبان تو یقیناً موجود تھی۔ لاہور بھی لاوھور، لھاوور لھوور متلفظ ہوتا تھا نہ کہ لاہور، لہور۔ فرزند لاہور مسعود سعد سلمان کو نیشاپور کسی سلسلے میں جانا پڑا تو لاہور کی یاد وہاں بھی برابر ستاتی رہی۔ عید کا دن بھی بے مزہ گزرا۔

رسید عید و من از روے خور دلبر دور
چگونہ باشم بے روے آں بہشتی خور
مرا کہ گوید کاے دوست عید فرخ باد
نگار من بہ لھاوور و من بہ نیشاپور

....

لاہور سے چند ماہ کی جدائی بھی اس حد تک ناقابل برداشت تھی کہ دس اشعار پر مشتمل پورا قطعہ کہہ ڈالا:

اے لاوھور ویحک بے من چگونہ ای
بے آفتاب روشن، روشن چگونہ ای
تو مرغزار بودی و من طیر مرغزار
با من چگونہ بودی و بے من چگونہ ای
تا ایں عزیز فرزند از تو جدا شدست
با درد او بہ نوحہ و شیون چگونہ ای

....

اس فرزند لاہور کا لاہور اونچے برجوں اور بارہ دروازوں والا لاہور نہ تھا تاہم بے حصار نہ تھا۔ آج باغوں کا شہر ہے تو اس وقت بھی مرغزار تھا۔ جمعیت بھی لاکھوں میں نہیں ہزاروں میں تھی۔

اسی لاہور میں ایک اور شاعرِ غرا، مسعود سعد سلمان لاہوری کا ہم عصر ابو الفرج رونی بھی تھا لاہوریوں کی زبان میں لاہوری جم پل' کہ مولد ومنشاے او لھاوور بود...... انوری پیوستہ تتبع سخنِ او کردے و دیوانِ او ہموارہ پیش نظر داشتے۔

کون انوری؟ فارسی شاعری کے تین پیغمبروں میں ایک پیغمبر،

در شعر سہ تن پیمبرانند
ہر چند کہ لانبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

یہی بات یوں بھی کہی گئی ہے:

در شعر سہ تن پیمبرانند
قولے کہ جملگی برانند
فردوسی و انوری و سعدی
ہر چند کہ لانبی بعدی

....

یہ تھی شان اس شہر ادب کی جس کے ایک 'جم پل' کے طرز کلام کی پیروی فارسی کے تین پیغمبران سخن میں سے ایک نے کی۔ اسی دور کا ایک فرزند ابو عبداللہ روزبہ بن عبداللہ النکتی لاہوری بھی تھا کہ نکات لطیف او از حد عدد فزوں است...... اسی لاہور کا ایک اور فرزند سید الکتاب جمال الدین علی لاہوری بھی تھا فن کتابت میں ابن مقلہ *اور ابن البواب کی ٹکر کا خوشنویس۔ ایک اور فرزند لاہور شاعر اجل حمید الدین بن مسعود شالی کوب** بھی تھا۔ از احرار خطۂ لاہور، در طبع زکی و شعرِ وے قرین عنصری و رودکی۔ اسی لاہور میں الامیر العمید جمال الفلاسفہ یوسف بن محمد الدربندی بھی گزرے ہیں نہ کہ صرف اقبال، اور لاہور میں دفن بھی ہوئے۔ اسی لاہور میں اقبال کا ممدوح شاعر عرفی شیرازی بھی فوت اور دفن ہوا۔ تیس سال بعد نعش نجف لے جا کر دفن کی گئی۔ اسی لاہور میں ایک اور شاعر ملا احمد جامی لاہوری بعہد شاہجہان گزرے ہیں۔ تاریخ گوئی میں لاثانی تھے۔

بیاض لاہور نمبر میں ایک مضمون کنہیا لال ہندی کا بھی لاہور کی وجہ تسمیہ کے بارے میں شامل ہے اور

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

کا نادر نمونہ۔ لاہور" کی بنیاد کس نے رکھی ہے کتب تواریخ میں مختلف روایتیں ہیں۔ عموماً مشہور ہے کہ مہاراجہ چندر اوتار کے فرزند لو نے یہ شہر آباد کیا اور لوہور نام رکھا۔ ہزارہا سال گزرنے کے سبب سے لوہور کا لفظ بگڑ کر لاہور ہو گیا۔ خلاصۃ التواریخ بھی اسی قول کی تصدیق کرتا ہے کہ لو اور کشو دو فرزندان دلبند مہاراجہ چندر اوتار کے تھے جب دونوں پنجاب میں رونق افروز ہوئے تو لو نے لوہور

---

*ابن مقلہ عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کا وزیر تھا، کتابت میں اس کا ضرب المثل۔ اسی نے خط کوفی کو رائج الوقت خط میں تبدیل کیا۔ تین بار وزیر ہوا اور تین بار معزول۔ خلیفہ رضی باللہ نے اس کا دایاں ہاتھ کٹوا دیا تو بائیں ہاتھ سے لکھنے لگا۔ پھر بائیں بازو سے قلم باندھ کر لکھنے لگا۔ لیکن کسی بار کتابت میں فرق نہ آیا۔ ابن البواب اسی کا پیرو تھا۔ ابن مقلہ تین بار وزیر تین بار معزول اور تین بار مختلف جگہوں پر دفن بھی ہوا۔ ** شالی فارسی اور پشتو میں دھان (Paddy) کہتے ہیں شالی کوب، دھان کوٹنے والا۔ شال، چاول، چاول ہندی زبان کا لفظ ہے۔ لاطینی Oryza، انگریزی rice جرمن ries عربی آرز۔ فارسی برنج، پشتو وریژی، وریژی، وراوڑی (تامل تلگو) کے الفاظ ہیں۔

یعنی لاہور اور کشو نے قصور آباد کیا۔ خلاصۃ التواریخ کے مصنف نے یہ نہیں سوچا کہ لو نے لو کے ساتھ ہور کیوں لگایا، ہور کے کیا معنی ہیں۔ اگر ہزارہا سال پہلے یہ شہر آباد ہوا تو پنجاب کا لفظ کیسے در آیا کہ خطۂ لاہور کو یہ نام اکبر کے دور میں ملا۔ پھر کشو میں حرف ش عربی کا حرف ہے سنسکرت یا ہندی کا نہیں۔ کشو کسو کیوں نہیں اور کشو کا کاف مبدل بہ ق کسے ہو گیا اور کشور سے قصور کیسے ہو گیا۔ اگر قصور اتنا ہی پرانا شہر ہے تو کشو کے ساتھ ہور کیوں نہیں لگایا۔ کنہیا لال ہندی نے مزید یہ بھی لکھا کہ بقول شیخ احمد زنجانی صاحب تحفۃ الواصلین ''اول اس شہر کو راجہ پرتھت نے آباد کیا...... دیپ چند نے...... پنجاب کا علاقہ اپنے برادر زادے لوہار چند کی جاگیر میں دے دیا...... اس شہر کا نام لوہار ہور اپنے نام پر رکھا۔'' صاحب مضمون نے تحفۃ الواصلین کو سلطان مسعود غزنوی کے عہد کی تصنیف بتایا ہے، جو بالبداہت غلط ہے۔ پنجاب کو پنجاب اکبر بادشاہ کے دور میں کہا گیا۔ اس سے پہلے کی کسی تصنیف یا تواریخ میں یہ نام نہیں ملتا، خطۂ لاہور کے الفاظ ملتے ہیں۔ صاحب مضمون نے ایک نام لہانوور (اعلان نون کے ساتھ) بھی لکھا ہے جو لہانور (غنہ کے ساتھ ہوگا) مہاراجہ چندر اوتار کون تھا جو ہزاروں سال پہلے گزرا اور راجہ پرتھت، دیپ چند اور لوہار چند کون تھے، کب گزرے؟ آیا ایسی کوئی پہلے کی تاریخ، تالیف یا تصنیف موجود ہے جس میں راجوں مہاراجوں کا ذکر ہو جنھوں نے لاہور کی بنیاد رکھی اور اس شہر کو یہ نام دیا۔ کنہیا لال ہندی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ خود خلاصۃ التواریخ اور تحفۃ الواصلین میں سے کس روایت کو درست مانتے ہیں۔ بے شک نام اور الفاظ سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے اور اس کے لیے متعدد علوم (Sciences) وجود میں آ چکے ہیں۔ ڈھکوسلے ان کی جگہ لیتے رہے۔ صاحبین خلاصۃ التواریخ و تحفۃ الواصلین اور خود کنہیا لال کو معلوم نہیں کہ لاہور نام کا ایک قصبہ اب تحصیل کا صدر مقام دریائے سندھ کے کنارے خیبر پختونخوا میں بھی موجود ہے جو لاہور راوی کے کنارے والے سے بھی قدیم تر ہے۔ سنسکرت کا عظیم نحوی پی نی نیں کا باسی تھا۔ یہ لاہور کس راجہ چندر اوتار، پرتھت، دیپ چند، لو یا لاہار چند نے آباد کیا تھا؟ گزشتہ زمانوں میں ہندوؤں میں تواریخ نگاری کبھی رہی ہی نہیں۔ رہے مسلمان تو ان میں ڈھکوسلوں اور بے سروپا روایتوں کو زیادہ پذیرائی حاصل رہی۔

بے شک بعض بستیاں بادشاہوں اور خاص افراد نے بھی بسائی ہیں لیکن ہر بستی کے بارے میں ایسا کہنا ممکن نہیں۔ بستیاں بستے بستے بستی ہیں۔ ان کے بسنے کی اور کوئی نام پانے کی مختلف وجوہات ہیں۔ Oxford ابتداءً وہ جگہ تھی جہاں گایوں بیلوں

کو لے جا کر پانی پلایا جاتا تھا اور آج؟ پشاور کے نواح میں ایک بستی بڈھ بیر، بڈا بیر، بڑا بیر، بیری کے ایک درخت کے نام پر ہے۔ پہلے اس جگہ کے مالک نے مویشی خانہ تعمیر کیا ہوگا بعد میں اس کی اولاد نے مزید گھر بنا لیے ہوں گے اور آج ایک قصبہ جس میں ایئر بیس بھی موجود۔ اسی پشاور میں ایک بستی پلوسی بھی ہے۔ پلوسی پشتو میں پھلاہی کے درخت کو کہتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ایک نام کے متعدد شہر اور بستیاں پاکستان اور بھارت دونوں موجود ہیں۔ منگلور نام کا ایک گاؤں مانسہرہ میں ایک سوات میں ایک جنوبی بھارت میں (بنگلور اور منگلور دو مختلف شہر ہیں) کالنجر نام کا ایک گاؤں ہری پور میں ایک اسی نام کا شہر بھارت میں، جالندھر ایک بھارت میں ایک وزیرستان پاکستان میں، صوابی نام کا ایک گاؤں ہری پور میں، ایک قصبہ اور تحصیل کا صدر مقام مردان ڈویژن میں اور اسی نام (Swabia) کا ایک خطہ جرمنی میں۔ لاہور ایک ہزار سال پہلے لہاوور اور لہوور تھا آج لاہور لہور ہے۔ وقت گزرنے سے بعض الفاظ کے معنی اور تلفظ تک بدل جاتے ہیں۔ بعض نام اور الفاظ ان زبانوں کے ہیں، جن کے بولنے والے نہیں رہے۔ پشاور جو آج پشور ہے کیا عجب ابتدا پشادھور یا پشادور ہو، لیکن وجہ تسمیہ جو بیان کی جاتی ہے یہ ہے کہ چونکہ یہ شہر باہر سے ہندوستان جانے والوں کے راستے میں پہلے پڑتا تھا اس لیے اسے پیش آور (فارسی) کہا گیا۔ توجیہہ معقول ہے اگر پشور دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ایک اور فارسی زبان کے وجود میں آنے سے بھی پہلے سے نہ ہوتا۔ دریائے سندھ کے کنارے ہی ایک اور بستی ہنھور (ضلع صوابی) بھی موجود ہے۔ ہنھور یقیناً کسی ایسی زبان کا لفظ ہے، جو آج معدوم ہے۔ جن بستیوں کے ناموں کا مطلب ومفہوم ہمیں معلوم نہیں وہ اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ ان کا نام رکھنے والے ہزارں سال پہلے گزرے اور یہ بستیاں ہزاروں سال پرانی ہیں۔

اس دھرتی کے باسیوں کی وہ نوع جو بنی آدم کہلاتی ہے آج سات ارب سے بھی زیادہ جمعیت رکھتی ہے بیس پچیس ہزار سال پہلے ہزاروں میں تھی۔ کئی ہزار سال پہلے شمالی اور جنوبی امریکہ ایشیا، یورپ اور افریقہ سے پیوست تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دو براعظموں کے لوگوں کے فیچرز مشرقی ایشیا کے باسیوں سے ملتے ہیں۔ کرۂ ارض پر بنی آدم کی کوئی نسل خالص نہیں حتیٰ کہ آسٹریلیا کے اصل باشندے بھی۔ ہزارہا سال پہلے انسانی زندگی دیگر حیوانات سے مختلف نہیں تھی۔ جملہ ذی حیات انواع میں جہد للبقا کے ساتھ ساتھ جہد للفنا کا سلسلہ بھی جاری تھا، آج بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ بقائے اصلح (Survival of the fillest) ہربرٹ سپنسر کا ڈھکوسلہ ہے۔ وائرس اور جراثیم انسان سمیت دیگر حیوانات پر وبا کی صورت میں حملہ کر کے انھیں ہلاک کر دیتے ہیں اور

انسان خود ساختہ اشرف المخلوقات ان کے مقابلے میں ہمیشہ عاجز ثابت ہوا ہے۔ ذی حیات انواع میں سے ہر ایک نے اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی وصف خاص پیدا کر رکھا ہے۔ نباتات تک میں بعض پودے اور درخت کانٹے دار بعض انتہائی زہریلے ہوتے ہیں اس کے باوصف بعض حیوانات نے اپنے اندر انہیں کھا جانے کا ملکہ یا وصف پیدا کر لیا ہوتا ہے۔ پس ذی حیات انواع میں سے ہر ایک کی حیات کا انحصار دیگر ذی حیات کے وجود پر ہے۔ اکاس بیل زمین سے نہیں اگتی لیکن اگر اس نرم و نازک بیل کا ایک سینٹی میٹر ٹکڑا بھی کسی تناور چھتنار درخت پر رکھ دیا جائے تو کچھ مدت بعد پورے درخت پر پھیل جاتی ہے اور درخت کو خوراک بنائے رکھتی ہے۔ انسان دیگر انواع کے مقابلے میں انتہائی کمزور ہے، نہ تیز دوڑ سکتا ہے نہ اُڑ سکتا ہے، نہ نوکیلے دانت اور تیز پنجے رکھتا ہے لیکن اپنی حفاظت کے لیے اس نے جس وصف خاص میں امتیاز حاصل کر رکھا ہے ذہانت ہے، یہی وہ وصف ہے جس کا محافظ ہے۔

آواز جملہ حیوانات میں کمیونیکیشن کا سب سے بڑا ذریعہ رہی ہے لیکن انسان نے ہونٹوں، دانتوں، تالو اور حلق کی مدد سے کچھ ایسی آوازیں بھی وضع کر لیں جو حروف تہجی کی صورت میں لکھنا سیکھنے کے بعد لکھی جاتی چلی آ رہی ہیں۔ ہر آواز کسی نہ کسی چیز یا بات کی علامت تھی۔ پھر دو، تین اور مزید آوازوں کو جوڑ کر الفاظ بنائے گئے۔ اینتھروپولوجی کے ماہرین نے نسل انسانی کو تین بڑی شاخوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور ان کی زبانوں کو بھی۔ لیکن یہ شاخیں بھی خالص نہیں Crossed ہوتی رہی ہیں۔ ان میں ایک شاخ جو آریا کہلاتی ہے (یہ نام اسے Max Muller نے دیا ہے) دوسری دو شاخوں کی طرح مختصر سی جمعیت کی حامل تھی۔ دیگر انواع حیوانات کی نسبت سب سے زیادہ اضافہ حیوان ناطق (rational amimal) کی تعداد میں ہوا۔ آریا شاخ کا اصل وطن کونسا تھا، مختلف مفروضے ہیں۔ جن پر بحث غیر ضروری ہے۔ دیگر دو بڑی نسلوں زرد (چینی، منگول، ترک وغیرہ) سیاہ (افریقی) کی طرح یہ بھی جو سفید (آریا) کہلاتی ہے قلیل تعداد میں تھی۔ اس نسل نے بھی گوشت اور دودھ کے لیے کچھ جانور بھی سدھا لیے تھے کہ شکار ہر وقت ممکن نہ تھا۔ افراد کی تعداد میں اضافے کے ساتھ نئی چراگاہوں کی تلاش میں کچھ نے برصغیر کا رخ کر لیا، کچھ نے ایران اور اس کے ملحقہ خطوں کو وطن بنا لیا اور کچھ یورپ کی طرف چلے گئے۔ یہ لوگ جب یکجا تھے تو ایک ہی زبان بولتے تھے۔ صدیوں کے بعد زمانی و مکانی کی وجہ سے یہ ایک زبان بھی کئی زبانوں میں ایسی تقسیم ہوئی کہ ایک دوسرے کی گفتگو کو سمجھنا ممکن نہ رہا۔ لیکن الفاظ و کلمات کی roots سے پتہ چلتا ہے کہ جملہ زبانیں ایک ہی زبان کی شاخیں ہیں۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر

پندرہ بیس میل کے بعد ایک زبان مثلاً پنجابی، پشتو وغیرہ بولنے والوں کے لہجے میں نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ آریا لوگوں کو آریا کیوں کہا گیا؟ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تصنیف The Discovery of India میں لکھا ہے:

The word arya comes from a root word meaning to till and the Aryans were agriculturist and agriculture was considered a noble profession.

''آریا بمعنی باوقار و بانجابت، طائفہ ای از ہندوارو پائی، مردے کہ پس از ورد بہ فلاتِ ایران دریں کمکان ثابت شد ند (فرہنگ معین)۔ یہی لفظ آریا بمعنی کھیتی باڑی کرنے والے کے Noble، باوقار اور بانجابت کے معنوں میں چالو ہو گیا۔ حالانکہ دوسری دو نسلیں زرد و سیاہ رنگ بھی تو کھیتی باڑی کرتی چلی آ رہی ہیں۔ وجہ وہ نہیں جو پنڈت جواہر نہرو نے بتائی ہے یا معین نے اپنی فرہنگ میں بتائی ہے۔ جو بات درست ہے صرف اتنی ہے کہ آریا کا روٹ 'رُ' ہے نوبل باوقار کے معنی از خود شامل کردہ ہیں۔ 'رُ' کی آواز انگریزی کے لفظ reap میں بھی شامل ہے، پشتو کے ریبل میں بھی، فارسی کے درو میں بھی (شاید پنجابی کے روانی میں بھی)

مزرعِ کشتِ فلک دیدم و داسِ مہِ نو
یادم از کشتہ ، خویش آید و ہنگام درو
(حافظ)

یہی آواز کاشتن کے مضارع کا رَد میں بھی موجود ہے، شجر کاری کے کاری میں بھی اور کارد (چھری) میں کاٹ اور کاٹنا کا مفہوم لیے ہوئے۔ فارسی میں درو گر چوب تراش کو کہتے ہیں۔ اگر نو پلٹی، وقار نجابت کی وجہ زراعت ہوتی تو ویش جاتی کے ہندو برہمنوں اور کھشتریوں سے زیادہ نجیب اور باوقار سمجھے جاتے۔ ''برہمن برہم (Supreme god) کے سر سے، کھشتری سینے سے، ویش پیٹ سے شودر پاؤں سے پیدا ہوئے۔'' برصغیر میں ''آریا'' ان لوگوں پر فتح پائی انھیں ملیچھ کہنے لگے حالانکہ یہ ملیچھ ان فاتحین سے زیادہ مہذب، باوقار و نجیب تھے۔ ''آریا'' بطور خاص خالص نسل نہیں۔ منوسمرتی سے پہلے یہ لوگ مفتوحین کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ سری کرشن مہاراج کالے رنگ کے دکھائے گئے ہیں۔ یہ بھی دلت تھے، جن سے آج کل نفرت کی جاتی ہے۔ یہ مفتوحین ان فاتحین سے زیادہ مہذب اور زراعت پیشہ تھے۔ بھگوت گیتا سری کرشن کی تعلیمات پر مشتمل ہے اور ہندو مذہب کا بہترین حصہ۔ شہزادہ داراشکوہ نے مجمع البحرین میں اسلام کی عارفانہ تعلیم اور بھگوت گیتا کی تعلیم کو at par ٹھہرایا ہے۔ اس موضوع پر مزید گفتگو اصل موضوع سے

بہت دور لے جائے گی۔ موئنجو ڈیرو اور ہڑپہ کی تہذیبیں قدیم مصری، بابلی و سمیری تہذیبوں کی نہ صرف ہم عصر تھیں بلکہ ان سے باہمی روابط بھی تھے۔ فاتح ہمیشہ اپنے آپ کو مفتوح سے برتر سمجھتا ہے۔ چینی تہذیب تو قدیم مصری اور بابلی تہذیبوں سے بھی قدیم تر ہے۔ جیومیٹری میں جو مسئلہ، مسئلہ فیثا غورس کے نام سے معروف ہے، اسے Lancelot Gogben کی تحقیق کے مطابق چینیوں نے دس ہزار سال پہلے حل کر لیا تھا (Mathematic for the Million)

بات کلمات کی roots کی ہو رہی تھی۔ انگریزی میں گھوڑے کو horse کہتے ہیں، سنسکرت میں اشو، پشتو میں اس، فارسی میں اسپ، کلمہ ایک ہے کوئی آواز کسی نہ کسی جگہ سے گر گئی انگریزی میں بکری کو goat کہتے ہیں یہی لفظ پشتو میں گڈ مینڈھے کے لیے خاص ہو کر رہ گیا لیکن گڈبہ چرواہے کے لیے، بھیڑ بکریاں چرانے والے کے لیے اب بھی استعمال میں ہے۔ یہی لفظ گڈریا اردو (ہندی) میں آج بھی موجود ہے جبکہ اردو (ہندی) والوں کو معلوم نہیں کہ بھیڑ بکریاں چرانے والے کو گڈریا کیوں کہا جاتا ہے۔ انگریزی awake اور wake کا پشتو کا وینخ (بیدار) ایک ہی رُوٹ سے ہیں، انگریزی love کا، ہندی کا لوبھ اور لُو، انگریزی much کا (نیوکسل میں مچ) کا سمرہ میں بھی مچ (بہت)، بارہ، بائیس، بتیس تا بانوے میں با دو کے معنوں میں اور یہی با، بائیسائیکل (bicycle) اور bifurcaiton میں موجود ہے۔

مثالیں بے شمار ہیں اور ان میں اضافہ غیر ضروری۔ یہ ہیں مختلف زبانوں کے باہمی لسانی روابط نہ کہ دو زبانوں میں مشترکہ طور پر دخیل الفاظ دریا، کوہ، ریگستان، آباد، برباد (فارسی) غم، مصیبت اولاد، رحمت (عربی) چاقو، آقا، خان (ترکی، منگولی) پرتگیزی بالٹی، لالٹین، کمرہ وغیرہ کے مستعمل الفاظ کی فہرست بنائی اور اردو بلوچی، اردو سندھی، اردو پنجابی وغیرہ کے لسانی روابط کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ (بچوں کا کھیل)

داد یم گرا زگنج مقصود نشاں
گر ما نہ رسیدیم و شاید برسی

آمدم بر سر مطلب و مقصود، لاہور کسی لوہار چند کا آباد کردہ شہر کا نام نہیں نہ کسی لو کا آباد کردہ ہے کہ اسی نام کی ایک بستی کے پی کے میں بھی موجود ہے اور لاہور بھی جواب لہور ہے لھاوور، لھوور تھا۔ یہ لفظ بے معنی نہیں۔ برصغیر میں ایک ہی نام سے متعدد دوسرے شہروں کا ہونا بلاوجہ نہیں۔ ان ناموں کا کوئی نہ کوئی کلچرل بیک گراؤنڈ موجود ہے۔ "آریا" سب سے پہلے برصغیر کے اس حصے میں وارد ہوئے جو اب پاکستان ہے۔ یہیں سے انڈیا کی جانب گئے۔ بعد میں آنے والوں نے پہلے آنے والوں کو

آگے دھکیل دیا - وور، وھور، الف کی آواز کا واو اور ی (یے) کی آواز میں بدل جانا، اسی طرح ب، پ، و، ف وغیرہ کی آوازوں کا اور ن اور م کی آوازوں کا ایک دوسرے کی جگہ لینا نئی بات نہیں ایک ہی زبان میں اس کی مثالیں موجود ہیں- فارسی اور پشتو دونوں میں سانپ کو مار کہتے ہیں- شمالی پشتون آ کی آواز سے مار اور جنوبی پشتون او کی آواز سے مور، شمالی پشتون مور کہے گا تو اس کا مطلب ماں (مادر) ہوگا جنوبی پشتون مور کو میر (یائے مجہول) کہے گا- پس یہ امر جائے تعجب نہیں کہ پٹھ وہار (پنڈی) کی طرح نوبہار (بلخ) بھی دو لفظوں نو اور وھار سے مل کر بنا ہو- اسی طرح پشاور، پشاوھور، پش وھور اور پیھور بھی پش وھور ہو جو مزید تخفیف سے پیھور رہ گیا ہے- نوبہار (بلخ افغانستان) کے بارے میں ایرانیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ مجوسیوں کا آتشکدہ تھا- لیکن اس دعوے کو روسی مستشرق سخاؤ نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ نوبہار مجوسوں کا آتشکدہ نہیں بدھ مت کے پیروکاروں کی عبادت گاہ تھی- سید سلیمان ندوی نے بھی مزید تحقیق کرتے ہوئے بتایا کہ اس طرح کے وہار سندھ میں بھی موجود تھے- بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ پورا پاکستان بدھ مت کا مرکزہ رہ چکا ہے اور پنڈی کا علاقہ اس کے مراکز میں شامل اس لیے پٹھ وہار کا خطہ بھی وھار کے نام سے موسوم ہوا، افغانستان میں ننگر ہار، چک ہار، قندھار، طرح کے نام بدھ دور کی یادگار ہیں-

پشاور کا خطہ بھی گندھارا کہلاتا رہا ہے- قندھار کو قندھار بعد میں کہا گیا- قندھار بھی گندھار ہی ہے- وھور، وھار کا لفظ زبان میں پہلے سے موجود تھا- مذہبی رسومات ادا کرنے کی جگہ- بدھ مت کے فروغ، کے زمانے میں بھی انہی معنوں میں مستعمل رہا- ھور کا لفظ استاد اجل سعدی نے سورج کے معنی میں برتا:

نور گیتی فروز چشمہ ھور
زشت باشد بچشم موشکِ کور

چمگادر کی طرح موشک (چھچھوندر) بھی دن کو اندھا ہو جاتا ہے، اسے سورج کی روشنی بری لگتی ہے- ھور کی آواز اھورا مزدا میں بھی موجود ہے، ہری کی آواز ہری اوم میں اور اہرمن میں بھی، ہردوار (ہر دووار) ہری دوار میں بھی - یہی آواز لاھور، لھاوور، پشاور (پشاوھور) پیھور (پے ھور، پے وھور) میں بھی موجود بلخ (افغانستان) کا نوبہار بھی اصل میں لووھار (لووھور، لاھور) ہی ہوگا- 'و' اور 'ب' مبدل بیکدیگر ہیں اور 'ل' اور 'ن' مبدل بیکدیگر اسی طرح الف اور واو- پنجابی میں نمک کو لُون کہتے ہیں اور ہندی میں نُون، امیر خسرو کی کہہ مکرنی ہے:

سرپ سلونا سب گن نیکا
وا بن سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پر ہووے کون
اے سکھی ساجن نے سکھی نُون

یہی نُون سلونا، سلونی میں موجود ہے-

☆☆☆☆☆

بیادِ یارِ دیرینہ

رشید امجد سے میری شناسائی کا دورانیہ پچاس سالوں سے تجاوز کر چکا تھا۔ تیس ستمبر 1970 کو جب سی بی کالج میں بطور اردو لیکچرار میری ملازمت کا آغاز ہوا اس وقت رشید امجد شعبہء اردو کے صدر تھے۔انہیں غالباً یہاں خدمات انجام دیتے ہوئے ڈیڑھ دو برس بیت چکے تھے۔یہ سخت نظریاتی آویزش کا زمانہ تھا۔ سارا ملک دائیں بائیں کی سہل، نام نہاد اور پاپولر تقسیم کا شکار ہو چکا تھا۔ یہ تو بہت بعد میں پتا چلا کہ مغربی سامراج نے روایت پرست لوگوں کے ہاتھوں میں اسلام اور مغرب پرست آزاد خیالوں کے ہاتھوں میں سوشلزم کا پرچم تھمائے رکھا۔ اور جو نزاع استحصالی قوتوں اور پسماندہ عوام کے درمیان ہونا چاہیے تھا اسے کمال حکمت عملی سے اسلام اور سوشلزم کا بے معنی تصادم بنائے رکھا۔

فلسفے کا طالب علم ہونے کے ناطے مجھے شروع سے ہی تخلیقی اذہان کا کسی سیاسی پارٹی کی سوچ میں مقید ہو جانا مناسب نہیں لگتا تھا۔ ان دنوں نظریاتی آویزش زوروں پر تھی اور ہمارے قلمکاروں کی اکثریت پیپلز پارٹی کی حامی تھی۔ رشید امجد بھی اسی رو میں بہہ رہے تھے۔ اقبال اور قائدِ اعظم کے افکار کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مجھے اس نقطہ ؟ نظر میں کچھ انتہا پسندی دکھائی دیتی تھی۔ اسی زمانے کی ایک غزل میں اپنے اس احساس کو میں نے یوں بیان کیا تھا۔

شہر کا حبس مٹانے کے بہانے عالی
ساتھ لے آئیں بیاباں کی ہوائیں کیا کیا

.....

اس نزاعی فضا کے زیرِ اثر کالج کے اسٹاف روم میں ہمارے درمیان اکثر گرما گرم نظریاتی بحث چل پڑتی۔ میں واہ میں قیام کے دوران ہر اتوار کو حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں شرکت کے لیے راولپنڈی آتا۔ نظریاتی آویزش سے نہ تو حلقے کی بحثیں محفوظ تھیں اور

جلیل عالی

نہ حلقے کے اجلاس کے بعد شالیمار ریستوران کی نشستیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار بحث کے دوران میں نے ایک صاحب سے جو بہت بڑے ماہرِ اشتراکیت سمجھے جاتے تھے، سوال کیا کہ انسان کے اندر اچھائی اور برائی کا شعور کہاں سے آیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس کے بارے میں بھی کارل مارکس نے کچھ کہہ رکھا ہے مگر اس وقت میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن کی آیت کے مطابق انسان کو اچھائی برائی کا شعور وہبی طور پر عطا کیا گیا ہے۔ اس پر ان کے منہ سے قرآن کے بارے کچھ ایسے نازیبا الفاظ نکل گئے کہ جنہیں سن کر مظہر الاسلام نے جو موصوف سے بہت متاثر بھی تھے، آستینیں چڑھاتے ہوئے شدید غصے میں کہا کہ سوشلسٹ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم قرآن بارے ایسے الفاظ کے استعمال کی اجازت دیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے کشیدہ حالات میں بھی نظریاتی اختلاف کے باوجود میرے اور رشید امجد کے آپسی تعلقات میں کوئی دراڑ نہ آئی۔

پھر 1972 میں میری شادی ہوگئی۔ بیگم سی بی کالج راولپنڈی کے شعبۂ نفسیات میں لیکچرار تھیں۔ میں واہ کینٹ کا سرکاری فلیٹ چھوڑ کر راولپنڈی آ گیا۔ اور راولپنڈی سے روزانہ واہ کینٹ کالج آنے والے چھوٹے سے گروپ میں شامل ہو گیا۔ اب ہم چار دوست رشید امجد، مشتاق قمر، غلام سرور اور میں اکثر کالج آمد اور پنڈی واپسی کا سفر اکٹھے کرتے تھے۔ ان دنوں سیالکوٹ سے کیمل پور تک برہان ٹرانسپورٹ والوں کی لمبوترے یونٹ والی اکلوتی بس سروس چلتی تھی جو واہ کینٹ کے اندر سے گزرتی تھی۔ لاری کا لفظ شاید اسی ہیئتِ کذائی والی بس کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ واپس پر کئی بار ہم بس میں سوئے سوئے صدر اترنے کی بجائے گنج منڈی اڈے میں پہنچ جاتے۔ سردیوں میں بس کے شیشے بند ہونے کے باوجود یخ ہوا بس کے اندر گھسی چلی آتی۔ ٹھنڈ سے بچاؤ کے لیے میں نے اور رشید امجد نے اکٹھے صدر بازار سے ایک ایک ڈفل خریدا۔ جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ استعمال میں تو کم ہی آتا ہے مگر جب کبھی احتیاطاً سردیوں میں باہر نکالتے ہیں تو ان دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

میں نے ستر کی دہائی میں رشید امجد کی افسانہ نگاری پر ایک مختصر سا مضمون لکھا جو نوائے وقت کے ادبی صفحے میں شائع ہوا۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ اس میں میرے بیان شدہ اس خیال کہ "رشید امجد کے بیشتر افسانے شعری تجربے سے جنم لیتے ہیں" کی تائید بعد کے کئی نقادوں کی تحریروں سے بھی

ہوتی رہی۔ پتا چلا کہ وہ افسانہ نگاری سے پہلے نثری نظمیں بھی لکھتے رہے ہیں۔ اس اعتبار سے افسانوں میں شعری تجربے کی موجودگی ان کی اسی خصوصیت کا تسلسل ہوگا۔ رشید امجد کو زندگی اور کائنات کی اسراریت بہت ہانٹ کرتی تھی۔ ان کے بیشتر اچھے افسانے مسٹری اور سریت ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا کہ سریت کا یہ منطقہ ہم دونوں میں مشترک دلچسپی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس منطقے کے نواح کے اشتراک کا ایک مظہر یہ بھی تھا کہ میرے چند مصرعوں کو تو ان کے کچھ افسانوں کے عنوانات بننے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ جیسے ایک افسانے کا عنوان ہے

"نہیں تعبیر کوئی"

جو میرے اس شعر کا ٹکڑا ہے کہ

ازل سے ایک بے منزل سفر میں ساتھ اپنے
کچھ ایسے خواب ہیں جن کی نہیں تعبیر کوئی

ایک اور افسانے کا عنوان ہے

"میسر ہی نہیں ہوتا اپنے پاس ہونا"

میرا شعر یوں تھا

مسلسل کوئی سرگوشی ہمکتی ہے لہو میں
میسر ہی نہیں ہوتا پر اپنے پاس ہونا

میری ایک نظم کے عنوان "پھول تمنا کا ویران سفر" کو بھی ان کے ایک افسانے کا سرنامہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔

انہوں نے اپنے افسانوں کے پہلے کلیات کے نام "وشتِ نظر سے آگے" میں بھی میرے اس شعر کو اعزاز بخشا

یہ دل شب و روز اس کی گلیوں میں گھومتا ہے
وہ شہر جو بس رہا ہے وشتِ نظر سے آگے

میری مزید عزت افزائی کہ انہوں نے اپنے ایک افسانوی مجموعے "عکسِ بے خیال" کا انتساب بھی میرے نام کیا۔

اگر مضائقہ نہ ہو تو اس حوالے سے ایک خاص واقعے کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ ہوا یوں کہ انہوں نے میرے ایک شعر سے لیے گئے ٹکڑے "نہیں تعبیر کوئی" کے عنوان سے جو افسانہ لکھا تھا اسی عنوان کو اپنے افسانوں کے ایک مجموعے کے نام کے طور پر منتخب کر لیا، جس کی اشاعت کا اہتمام لاہور میں ہمارے دوست اشرف سلیم کے سپرد تھا۔ اس نام کا ٹائٹل اشاعت کے آخری مراحل میں تھا کہ انہی دنوں رشید امجد کی افسانہ نگاری کے حوالے سے مظفر علی سید مرحوم نے اپنے ایک انگریزی اخباری کالم میں یہ لکھ دیا کہ رشید امجد کے کئی افسانوں کے عنوانات اشعار کے ٹکڑوں پر مشتمل ہیں۔ اس سے رشید امجد ایسے بدکے کہ انہوں نے کتاب کا نام ہی بدل دیا۔ تاہم اپنی فطری شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کتاب کے آغاز میں متعلقہ شعر درج کرنا نہیں بھولے۔

مجھے ہمیشہ اس بات پر حیرت رہی کہ رشید امجد میں زندگی اور کائنات کی اسراریت سے مرکزی دل چسپی کے ساتھ روزمرہ ملکی سیاست سے اتنا زیادہ لگاؤ؟ کیوں ہے۔ یہ تو درست ہے کہ سیاسی عمل معاشرے کے تہذیبی تشخص پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے کوئی تخلیق کار اس سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ اور معاشرے کی سیاسی حرکیات سے باخبر رہنا ایک ذمہ دار اور بیدار نظر تخلیقی فنکار کے لیے ضروری ہے مگر پارٹی سیاست میں ملوث ہو جانے میں تنگ دائرے کی جانب داری کا امکان بڑھ جاتا ہے اور فنکار کے دور رس ویژن پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

واہ کینٹ کالج میں تو ہماری رفاقت دو ایک سال ہی رہی۔ پھر رشید صاحب ایف جی سر سید کالج راولپنڈی منتقل ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد غلام سرور اور مشتاق قمر بھی ان کے ساتھ جا ملے۔ پانچ ایک برس کے بعد میں بھی پنڈی تبادلہ کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں 1979 میں سر سید کالج راولپنڈی آیا تو اس وقت بزرگ شاعر جمیل ملک صدر شعبۂ اردو تھے۔ ان کی سر پرستی میں رشید امجد اپنے رفیقِ کار فاروق علی شاہ کے ساتھ مل کر اردو ادب کے ایک شاندار تاریخی منصوبے "پاکستانی ادب" کی ترتیب و اشاعت کا کام کر رہے تھے۔ سات ضخیم جلدوں پر مشتمل جملہ اصناف ادب کی منتخب تحریروں کی یہ پیشکش بے شک ایک غیر معمولی کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔ شعری اور تنقیدی نگارشات کے انتخاب میں تھوڑی بہت معاونت کا اعزاز خاکسار کو بھی حاصل ہوا۔ اسی دوران روز نامہ نوائے وقت کے ادبی صفحے میں ڈاکٹر صاحب پر ایک خاص کیمپ کو فوقیت دینے کا الزام لگایا گیا۔ نظریاتی اختلاف کی بنا پر ڈاکٹر صاحب اپنے تئیں اس بیان کا ملبہ مجھ پر ڈال کر ایک عرصہ میرے ساتھ اکھڑے اکھڑے رہے۔ اور جب ان پر متعلقہ بیان کے پیچھے کارفرما اصل کردار کی حقیقت کھلی، تب جا کر میری طرف سے ان کا دل صاف ہوا۔ اس اپنی سوڈ کا ذکر انہوں نے اپنی خوبصورت آپ بیتی "عاشقی صبر طلب" میں بھی کر رکھا ہے۔

1992 میں آرمی پبلک اسکول میں اول آئے ہوئے میرے بڑے بیٹے ثوبان نے ہمارے کالج کے پری انجینئرنگ گروپ میں داخلہ لیا۔ رشید امجد صاحب کالج میگزین "سرسیدین" کے انچارج تھے۔ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ ثوبان نے آرمی پبلک اسکول میں کچھ طلبا سے مضامین لکھوا کر اور کچھ مضامین طلبا کے نام سے خود لکھ کر اور اپنے قلم سے املا کر کے "اینگلز" کے نام سے ایک رسالہ نہ

صرف مرتب کیا بلکہ اپنے پیسوں اور طلبا کے چندے سے اس کی بہت سی فوٹو سٹیٹ کاپیاں کروا کر اساتذہ اور طلبا میں تقسیم کیں۔ ثوبان کے اس تجربے اور صلاحیت کے پیشِ نظر مجھے بتائے بغیر انھوں نے اسے "سرسیدین" کا طالب علم ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ ان کا یہ فیصلہ ثوبان اور میرے لیے خوشگوار حیرت کا باعث بنا۔ مجھے اس بات پر بہت طمانیت ہوئی کہ ثوبان نہ صرف ان کی توقعات پر پورا اترا اور پرچے کی ترتیب میں اپنی محنت اور لگن منعکس کرنے میں کامیاب رہا بلکہ اس نے پڑھائی کے میدان میں بھی بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا۔ یہاں یہ بات بھی درج کرنے کی ہے کہ رشید امجد صاحب نے اپنے چھوٹے بیٹے حسین رشید کو میرے سیکشن میں داخل کروا کر بھی مجھے دلی قربت کا گہرا احساس دلایا۔

مجھے اپنے ساتھ بیتا ایک تلخ واقعہ یاد آ گیا۔ واقعے کی تفصیل تو خاصی طویل ہے۔ یہاں اس کا صرف وہ حصہ بیان کرتا ہوں جس کا تعلق ڈاکٹر صاحب سے بھی بنتا ہے۔ ہوا یوں کہ کچھ میری شرافت کا فائدہ اٹھا کر اور کچھ اپنی شاطرانہ چرب زبانی سے کام لے کر ایک پہلوان نما ٹھگ میرے گھر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ مختصر یہ کہ ہمارے جانتے بوجھتے ہوئے وہ ہم سے کچھ رقم لے ہی مرا۔ ابھی اسے رخصت کر کے ہم خجالت اور حواس باختگی سے نکل بھی نہ پائے تھے کہ ڈاکٹر صاحب بھابی محترمہ کے ساتھ تشریف لے آئے۔ ہمارے چہروں پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر پوچھا کہ کیا بات ہے کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ میں نے قصہ بیان کیا تو بولے کوئی بات نہیں عالی صاحب جو وضع قطع آپ نے بیان کی ہے اور اس کی جن باتوں کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، چاہے اسے آپ کے پاؤں بھی پکڑنا پڑ جاتے اس نے آپ سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی جان چھوڑنی تھی۔ اس شخص نے اپنی چرب زبانی سے مجھے گھر کی تیسری منزل سے نیچے اتار لیا تھا اور میری جیب بھی ہلکی کر گیا تھا۔ چند روز بعد وہ شخص ہوٹل کے ریسٹوران میں، جہاں ہم روزانہ شام کو گپ شپ کے لیے بیٹھتے تھے، ایک میز پر اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ روسٹ اڑاتا دکھائی دیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو متوجہ کیا تو بولے دفع کریں یہ لوگ پولیس والوں کے ساتھ مل ملا کر ہی ایسے دھندے کرتے ہیں۔

رشید امجد کو قدرت نے ایک ہی نشست میں مکمل افسانہ لکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت سے نواز رکھا تھا۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ کسی خالی پیریڈ میں ان پر تخلیقی لہر آتی اور وہ ہم سے باتیں بھی کرتے جاتے اور لکھتے بھی جاتے۔ پتا چلتا کہ

پینتیس چالیس منٹ کے وقفے میں ایک خوبصورت اور منفرد افسانہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو چکا ہے۔ میں انہیں یہ کہہ کر چھیڑا کرتا تھا کہ آپ کا لاشعور آپ کے شعور سے زیادہ فعال اور مرتب و مربوط ہے۔

ڈاکٹر صاحب طلبا کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ چونکہ وہ خود ایک سیلف میڈ آدمی تھے اس لیے زندگی میں آگے بڑھنے کی تڑپ رکھنے والے طلبا کی مدد کرنے کو ہر لمحہ تیار رہتے تھے۔ انہوں نے یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران کتنے ہی نوجوانوں کو ذاتی دلچسپی سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مراحل طے کروائے۔ بعض احباب نے انہیں غلط بخشی کے طعنے بھی دیے مگر وہ فیض ارزانی کرنے میں کبھی متامل نہ ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب سیر و سیاحت کے بہت شوقین تھے۔ کالج کے ہم آٹھ نو دوست ہر برس گرمیوں کی تعطیلات میں دس بارہ روز کے لیے شمالی علاقوں کی طرف کہیں نہ کہیں نکل جاتے تھے۔ خاص اس مقصد کے لیے سب نے اپنا اپنا سلیپنگ بیگ خرید رکھا تھا۔ ہر سیاحتی دورے میں بس یا ویگن کی سواری کے ساتھ ساتھ میلوں پیدل سفر بھی شامل ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کبھی تھکاوٹ کا اظہار نہ کرتے۔ انہوں نے ہمیشہ بہت اچھے ہم سفر ہونے کا ثبوت دیا۔ وہ رفقائے سفر سے ہر طرح کی معاونت میں پیش پیش رہتے۔ ایک بار ہم کرائے کی ویگن کے ذریعے گلگت سے ہوتے ہوئے خنجراب پاک چین سرحد کی بلندی پر پہنچ گئے۔ یخ ہوا کے ساتھ ہلکی ہلکی برف باری بھی شروع ہو گئی۔ سرحد پر صرف ایک برجی سی بنے ہوئی تھی۔ ہم سب اپنی ترنگ میں برجی سے آگے چینی سر زمین پر پیدل چلتے چلے گئے۔ کوئی دو اڑھائی کلومیٹر کے بعد چین کی پہلی حفاظتی چوکی آ گئی۔ وہاں موجود چینی سپاہیوں نے کسی تعارض کی بجائے پر تپاک انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہمیں گرم گرم قہوا پلایا اور چینی سازوں پر اپنے ثقافتی نغموں سے بھی محظوظ کیا۔ واپسی پر سرحدی برجی کے قریب ہمیں ایک پاکستانی سپاہی ملا اور خفگی سے بولا کہ ہم نے غیر قانونی طور پر سرحد کیوں پار کی۔ تھوڑی بہت تکرار ہوئی تو ہم نے اس سے کہا کہ تم بھی تو یہاں ڈیوٹی پر موجود نہیں تھے نا! اس پر وہ نرم پڑ گیا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

جب محمد منشا یاد نے ممتاز مفتی کے ایما پر "رابطہ" کی ماہانہ نشستوں کا آغاز کیا تو راولپنڈی سے رشید امجد اور مجھے بھی اس کا رکن بنا لیا۔ ہر ماہ کسی ایک رکن کے ہاں "رابطہ" کا اجلاس ہوا کرتا تھا جس میں دو تین احباب اپنی نگارشات پیش کرتے اور ان پر گفتگو ہوتی۔ کوشش یہ ہوتی کہ گفتگو

میں حلقہ ارباب ذوق والی بے لحاظی کا ماحول پیدا نہ ہو۔ اجلاس کے اختتام پر میزبان کی طرف سے مہمانوں کو رات کا پر تکلف کھانا پیش کیا جاتا۔ اگرچہ رابطے کے منشور میں سختی سے سنگل ڈش کی پابندی عاید کی گئی تھی مگر کوئی رکن اس پر عمل نہیں کرتا تھا۔ یہاں میں قدرت اللہ شہاب کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ صرف انہوں نے منشور پر عمل کرتے ہوئے اپنی باری کے کھانے کو بلا جھجک سفید چاول اور ثابت مسور تک محدود رکھا۔ اور ہم سب کے دلوں پر اپنی شخصیت کی درویشی اور استقامت کا گہرا نقش مرتسم کر دیا۔ میرے اور ڈاکٹر صاحب کے سوا کم و بیش رابطے کے تمام اراکین اسلام آباد کے رہائشی تھے۔ ہم دونوں باہمی مفاہمت سے پٹرول کے پیسے بچانے کے لیے بیگمات کے ہمراہ باری باری ایک دوسرے کی گاڑی پر اسلام آباد جاتے تھے۔ ان اجلاسوں کی وجہ سے ہی ہم دونوں کو کسی مناسب جگہ پر ذرا بڑے گھر بنانے کی ترغیب ہوئی۔ رشید امجد راجہ بازار کے ایک گنجان علاقے میں رہتے تھے جہاں اراکین کا پہنچنا خاصہ دشوار تھا اور کہیں قریب گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ بھی دستیاب نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے عمر بھر کی جمع پونجی سے گلستان کالونی میں ایک پلاٹ خرید کر مکان تعمیر کروایا۔ میں آرائے بازار میں کرائے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ مجھے جب دو ایک بار رابطے کے بیس پچیس مہمانوں کو بٹھانے کے لیے گراونڈ فلور پر مالک مکان کی بیٹھک مستعار لینا پڑی تو میں بھی سنجیدہ ہوا اور والد مرحوم کے ترکے میں ملی اپنے حصے کی زمین اور بیگم کا زیور بیچ کر اور والدہ اور ایک بھائی سے قرض لے کر چکلالہ سکیم 3 میں دس مرلے کا بنا بنایا گھر خریدنے میں کامیاب ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد مختلف یونیورسٹیوں میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آخری سات آٹھ برس انہیں مختلف عوارض کا مقابلہ بھی کرنا پڑا مگر انہوں نے درس و تدریس اور لکھنے لکھانے کی فعالیت میں زیادہ کمی واقع نہیں ہونے دی۔ وہ میرے ہاں "زندہ لوگ" کی ماہانہ نشستوں میں ایک عرصے تک باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے مگر جوڑوں اور سانس کی تکلیف کے باعث اب مشکل سے سیڑھیاں چڑھ پاتے تھے۔ سال بھر سے تو کرونا کے باعث اجلاسوں کا سلسلہ بھی معطل تھا۔ ان کی وفات سے چند روز پیشتر میں نے فون پر استدعا کی کہ ڈرائیور سے کہیں کہ کسی وقت ہماری مارکیٹ کی طرف آتے جاتے میرے ہاں

سے میری تازہ تنقیدی کتاب لے جائے۔ بولے میں نیا ٹیل کا بل ادا کرنے صدر آیا ہوا ہوں، واپسی پر کھڑے کھڑے دروازے ہی سے آپ سے کتاب لے لوں گا، اندر نہیں آؤں گا۔ جلدی میں بھی ہوں اور آپ کی سیڑھیاں چڑھنے سے بھی بچنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا اپنے بل آپ اون لائن کیوں نہیں ادا کرتے۔ کہنے لگے یار مجھے موبائل سے اون لائن ادائیگی کا طریقہ نہیں آتا۔ میں نے جلدی جلدی کتاب کے ایک نسخے پر پیشکش کے چند الفاظ لکھے اور ان کے انتظار میں اپنے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ تشریف لے آئے۔ میرے سیڑھیاں اتر کر گیٹ تک پہنچنے سے پہلے وہ گاڑی سے باہر آ چکے تھے۔ سلام دعا کے بعد میں نے کتاب پیش کی۔ دیکھ کر بولے یار بہت اچھی چھپی ہے۔ نام بھی خوب ہے۔ پہلی فرصت میں پڑھ کر بات کروں گا۔ میں نے کہا آپ کی افسانہ نگاری پر جو میرا طویل مضمون ہے، اس میں اسے مت تلاش کیجیے گا، یہ سارے مضامین شاعری کے حوالے سے ہیں۔ کافی عرصے سے ان کے چہرے پر ایسے تاثرات نمایاں رہتے تھے جیسے بہت جلدی میں ہوں۔ وہ گیٹ سے ہی رخصت ہو گئے۔ اگلے روز ہمارا بیٹا میزان ہم میاں بیوی کو بچوں کے پاس ملتان لے گیا۔ مشکل سے چار پانچ روز گزرے ہوں گے کہ ایک صبح نو بجے کے قریب ان کے ہمسائے اور بچپن کے دوست غلام سرور کا فون آیا کہ عالی یار رشید امجد ہمیں چھوڑ گیا! میں سناٹے میں آ گیا۔ پوچھا کیا ہوا! بولا سانس کی تکلیف بڑھی تو رات ہسپتال لے گئے اور ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے۔ میت ابھی ہسپتال ہی میں پڑی ہے۔ میں نے احباب کی اطلاع کے لیے فوری طور پر یہ المناک خبر فیس بک پر درج کر دی۔ مگر میں خود بھی کافی دیر بے یقینی کی کیفیت میں رہا اور دل میں یہ کھٹکا رہا کہ کہیں غلط خبر کا اندراج تو نہیں کر دیا۔ اور میری اہلیہ نے بھی مجھے کہا کہ بھابی سے کنفرم تو کر لیتے۔ تھوڑی دیر میں اختر عثمان کا فون آ گیا۔ اس نے مرحوم سے میری دیرینہ دوستی کے ناتے مجھ سے تعزیت کی اور بتایا کہ گھر والوں سے پتا چلا ہے کہ جنازہ بیرونِ ملک سے بیٹوں کی آمد پر کل ہوگا۔

اردو افسانے کا ایک ممتاز، منفرد اور رجحان ساز تخلیق کار زندگی اور کائنات کے گمبھیر بھیدوں کے تعاقب میں اتنی دور نکل گیا جہاں سے واپسی ممکن نہیں!

انا للہ وانا الیہ راجعون!

☆☆☆☆☆

رشید آفریں کا ''چراغِ اُخوّت''

جناب رشید آفریں شہرِ اقبال اور شہرِ فیض احمد فیض سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ماشاء اللہ عمر کی آٹھ دہائیاں گزار چکے ہیں۔ ''چراغِ اخوت'' اُن کا ساتواں شعری مجموعہ ہے اور اس مجموعے کی خاص بات بقول خود اُن کے یہی ہے کہ ''اس مجموعۂ کلام کی غزلوں کے بیشتر اشعار وطن سے محبت، ہم وطنوں کو درپیش مسائل اور بساط بھر پند و نصیحت اور اصلاح و فلاح سے مملو ہیں، تاہم غزل کی اصل روایت سے منسلک رہنے کی سعی بھی موجود ہے''۔ ان کا مجموعۂ کلام پڑھ کر قاری یقیناً کتاب میں شامل ان کی پیش گفتار کے اس اقتباس سے اتفاق کرے گا۔

۲۱۴ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں ۳ محامد، سات نعتیں، ۲ مناقب، ۴۳ غزلیں، ۲۳ نظمیں، ۱۰ منظوم تأثرات، ۴ متفرق نظمیں اور گیارہ قطعات شامل ہیں۔ قبل ازیں ان کی جو کتب شائع ہو چکی ہیں ان کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا۔ دجہِ آفریں۔ دستِ ساحل۔ دامنِ احساس۔ فخرِ دو عالمؐ۔ بزمِ یاراں اور حصارِ جنوں۔ ساتواں شعری مجموعہ یعنی ''چراغِ اخوت'' جولائی ۲۰۲۱ء میں شائع ہوا ہے جو ناشر فدا پبلی کیشنز نے نہایت محبت اور سلیقے سے شائع کیا ہے۔ خوبصورت سرورق سبز رنگوں کے پس منظر میں ایک روشن چراغ کے ساتھ کھلتے ہوئے پھولوں کا منظر نامہ پیش کر رہا ہے جبکہ ناشرین کی عام روش کے برعکس کتاب نہایت عمدہ سفید کاغذ پر شائع کی گئی ہے جس کی قیمت ۹۰۰ روپے رکھی گئی ہے تو آج کی شدید مہنگائی کے دور میں یہ کچھ زیادہ بھی نہیں لگتی۔

رشید آفریں کی تخلیقی وسعت کا دائرہ حمد و نعت سے لے کر غزلوں اور نظموں تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کی حمد و نعت کی سرشاری اور غزلوں کی دلداری کے ساتھ اہم قومی موضوعات، نامور مشاہیر اور قوم کو درپیش مسائل پر اُن کی تخلیقات پہلے بھی مختلف جرائد میں نظر سے گزرتی رہی تھیں، لیکن اب جب اُن کے اِس تازہ مجموعے میں ان تمام حوالوں سے یکجا ان کا کلام نظر نواز ہوا تو بیحد متأثر بھی ہوا اور خوش بھی، کہ ماشاء اللہ اِس عمر میں جب مرزا غالبؔ بھی کہہ اُٹھے تھے کہ ''مضمحل ہو چکے قویٰ غالبؔ''، جناب رشید آفریں تخلیقی سفر پر ابتدائے عمر جیسی ہی سرگرمی

نسیمِ سحر

اور تحرک سے رواں دواں ہیں، اُن کے قلم میں اور نہ اُن کی تخلیقی روانی میں کوئی تھکن یا اضمحلال کی کیفیت دکھائی دی ہے۔ اُن کی تخلیقی زرخیزی کا ایک اہم پہلو اُن کا عاشقِ رسول کے طور پر حمد و نعت میں نئے نئے انداز سے عشق و عقیدت کا اظہار بھی ہے، جو اُن کی حمد و نعت کو والہانہ انداز دے رہا ہے، ان کی ایک نعت کا صرف یہ ایک شعر اُن کی پوری ذات کا حوالہ ایک سچے عاشقِ رسول کے طور پر پیش کر رہا ہے:

نعت ہی میرا وسیلہ بن گئی ہے روز و شب
جس سے ہر پل ہے فزوں قلب حزیں کی آبرو

.....

مجموعی طور پر مجھے اُن کی تخلیقات میں نئے نئے اور اچھوتے قافیوں کے ساتھ ساتھ عمدہ ردیفوں نے بڑا متاثر کیا ہے، اور یہی اُن کی ایک اہم تخلیقی جہت ہے جس نے ان کے کلام کو بہت سے دیگر شعراء کی نسبت نمایاں طور پر اجاگر کیا ہے۔ وہ غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہو کر غزل سرائی کرتے ہیں۔ یوں تو ان کی تقریباً سبھی غزلیں دامنِ دل کو کھینچتی ہیں مگر مختصر بحر میں ان کی غزلیں تو خاصے کی چیز محسوس ہوتی ہیں، اور اُن میں سہلِ ممتنع کا وصف بھی ایک زیریں رو کی طرح رواں دواں ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ رشید آفریں مشکل پسندی سے شعوری طور پر بھی گریزاں رہتے ہیں کہ انہیں اس بات کی بخوبی آگاہی ہے کہ مشکل پسند تخلیق کار اپنا قاری اور سامع کھو بیٹھتا ہے۔ اُن کی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے غزل کے روایتی موضوعات کے دائرے سے نکل کر بھی لکھا ہے اور وہ اپنے عہد کے ساتھ بھی اور اپنے بعد آنے والے نئے دور کے ساتھ بھی اسی رفتار سے چل رہے ہیں، اور غزل کے موضوعات و لفظیات میں جو نیا لہجہ اور اسلوب آ رہا ہے اُس سے بخوبی آگاہ ہیں:

خار و خس بھی تھے لرزہ بر اندام
خوف تھا ایسا چھایا آنگن میں

.....

ہم کو تو رت جگے ہی لے ڈوبے
کوئی جگنو نہ پایا آنگن میں

.....

آدمیت ہے جاں بلب ہر جا
اپنی خفت چھپا رہا ہوں میں

.....

مجھے اب آفریں تم جامِ جم سے کم نہ جانو
بظاہر جھونپڑی کے طاق پر رکھا دیا ہوں

.....

اُن کا مذہبی اور دینی رجحان ان کی حمد و نعت کے ساتھ ساتھ اُن کی غزلوں میں بھی جلوہ افروز ہے۔ اسی طرح مذہب کے ساتھ ساتھ وطن پرستی کا جذبہ بھی اُن کی نظموں کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی اپنا اظہار کرتا ہے:

بسی ہے آفریں اس میں مہک خونِ شہیداں کی
اسی اعجاز فطرت سے عدو بھی تھرتھراتے ہیں

.....

یہی وطن پرستی اور حب الوطنی اُن کی نظموں میں ایک اِکائی کی صورت میں نمو پا کر نقطۂ عروج پر

پہنچ جاتی ہے جو نہ صرف ان کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے بلکہ وہ یہ وطن پرستی کا جذبہ اپنے کلام کے ذریعے اپنی آنے والی نسل کو بھی منتقل کر کے انھیں پیغام دیتے ہیں کہ انھیں اپنے پیارے وطن کے لیے کیا کرنا ہے:

سنو اے نونہالانِ چمن، خود کو بدلنا ہے
بنام حرمتِ ارضِ وطن، خود کو بدلنا ہے
سیاست میں تقاضا ہے جواں مثبت رویوں کا
کرو تم دُور بوسیدہ گھٹن، خود کو بدلنا ہے

....

یہ کس قدر قابلِ داد اور قابلِ تحسین ہے کہ وہ نئی نسل سے اُمیدیں وابستہ کر رہے ہیں اور انھیں یہ پیغام بھی دے رہے ہیں کہ اگر وہ موجودہ ماحول میں پھیلی ہوئی نفسانفسی اور گھٹن کو بدلنا چاہتے ہیں تو پہلے خود کو بدلیں اور مثبت رویے اختیار کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کی یہ پوری نظم ”خود کو بدلنا ہے“ ایک ایسی اہم نظم ہے جسے تعلیمی نصاب میں شامل ہونا چاہیے کہ اس کے ہر شعر میں نسلِ نو کے لیے ایک پیغام اور ایک دعوت عزم ہے۔ اسی طرح نفاذِ اردو کے اہم موضوع پر بھی ان کی نظمیں کمال کی ہیں، اور یہ بھی نئی نسل کے لیے دعوت فکر و عمل کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی نظموں میں شخصیات کے علاوہ دیگر موضوعات بھی قابلِ توجہ ہیں، شادی، رخصتی اور دیگر تقریبات کے حوالے سے ان کی نظمیں اُن کے سماجی رشتوں کی پائیداری اور قربت کا اعلان کرتی ہیں، جو ہمارے بکھرتے ہوئے معاشرے کے لیے ایک پیغام کا درجہ رکھتی ہیں۔

جناب رشید آفریں کی وطن پرستی یا حب الوطنی کا احساس ان کے انتساب سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے ”مملکتِ خداداد (پاکستان) کے نام“ کیا ہے۔

اس دیدہ زیب اور شاندار کتاب پر عہد رواں کے ممتاز قلمکاروں نے تقاریظ لکھ کر رشید آفریں کی ادبی خدمات اور تخلیقی زرخیزی کا برملا اعتراف کیا ہے۔ ان قلمکاروں میں محمد قیصر فدا، ڈاکٹر تصدق حسین، ریاض حسین زیدی اور عبدالکریم خالد جیسی نامور ہستیاں شامل ہیں۔ ڈاکٹر تصدق حسین نے اپنے دیباچے ”ایک یادگار پیار کی تعمیر“ کا اختتام یوں کیا ہے ”یہ ان کا ساتواں شعری مجموعہ ہے۔ سات کا عدد مبارک عدد ہے مگر ہم نہیں چاہیں گے کہ یہ ان کا آخری مجموعہ ہو۔ ہم ان کی اگلی کتاب کے منتظر رہیں گے اور بارگاہ ایزدی میں اُن کی صحت، تندرستی اور سلامتی ایمان کے قائم رہنے کی دُعا کرتے ہیں“۔ راقم السطور بھی ان کی دعا میں شامل ہو کر جناب رشید آفریں کو ”چراغِ اخوت“ کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہے کیونکہ وہ یہ تو ضرور کہہ رہے ہیں کہ:

”آج کی اس مہیب سی رُت میں
آفریں شاعری نہیں ممکن“

....

مگر ایسا کہنے کے باوجود وہ یہ کمال بھی کر رہے ہیں کہ اس ناممکن کو ممکن بنا رہے ہیں۔ چنانچہ ہمیں اُن کے آٹھویں مجموعے کا ابھی سے انتظار ہے۔

☆☆☆☆☆

توصیف تبسم اور ان کا ''کوئی اور ستارہ''

بات یہ ہے کہ شروع سے ہی رنگ میری کمزوری، تصویریں میری محبت اور اظہار میری مجبوری رہا ہے۔ نصابی اور غیر نصابی کتابوں، مُلکی اور غیر مُلکی رسالوں میں ورق ورق چمکتی تصویروں اور ان کے رنگوں کی دل کشی کب تصویری فن پاروں کی نمائشوں کی سیر کے معمول میں ڈھلی، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ شائد جرمنی میں مقیم میرے لاہوری فن کار دوست امجد علی کی رفاقت کی دین ہے۔ کالج کے دنوں میں وہ ''التفاتاً'' مجھے لاہور میں ہونے والی نمائشوں میں لے جاتا اور میں ''انتقاماً'' اسے مشاعروں میں لے جاتا۔ وہ شاعری میں مناظر ڈھونڈتا رہتا اور میں مناظر میں شاعری۔ یہ سلسلہ لاہور اور پاکستان کی حدود پار کر کے جرمنی، ہالینڈ، بیلجیم، برطانیہ اور یورپ کے دوسرے فنی و ثقافتی مراکز آرٹ گیلریز تک پھیلتا چلا گیا۔ اس دیوانگی میں اس دوران میں ایک اور دیوانہ بھی آ شامل ہوا؛ بنگلہ دیش کا شاعر، ادیب اور براڈ کاسٹر جاہد الحق۔ ''دو سے بھلے تین''! افسوس، اب امجد اور جاہد کے بغیر ہی مجھے کینیڈا، شمالی امریکہ میں یہ مہم سر کرنا پڑتی ہے۔

کلاسیکی اور جدید فن پاروں کی نمائشیں اب بھی میرے ذوق کی تسکین کا باعث ہیں۔ ہاں، کبھی کبھی یہ تسکین مجھے کسی شعری مجموعے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے جس میں شاعر نے لفظوں سے تصویر کشی کی ہوتی ہے، منظر تراشے ہوتے ہیں، لافانی فن پارے تخلیق کیے ہوتے ہیں۔ انہی میں سے جب کوئی آنکھ میں ابھرتا اجنبی منظر سینے میں کھلنے لگے تو میری داخلی کیفیت وجد آشنا ہونے لگتی ہے۔ اب حال ہی میں جب رنگا رنگ تخلیقی فن پاروں سے آراستہ ایک بہت قیمتی شعری مجموعہ مجھے برادرم نوید صادق کی وساطت سے موصول ہوا تو دل واقعی جھوم جھوم اٹھا۔ نگاہ کے سامنے جناب توصیف تبسم کا''

حامد یزدانی

کوئی اور ستارہ" کیا کھلا رنگ و تخلیل کا ایک ارژنگ باب تحیر کی طرح وجدان پر وا ہوتا چلا گیا۔ شعر در شعر، مصرع در مصرع ڈوبتے اُبھرتے مناظر دید کی حدوں کو پار کر کے کب دل کی گہرائی میں جا اترے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ ایک اعلیٰ فن کار کا کمال یہی ہے کہ وہ غیر محسوس طور پر ہماری زندگی، ہماری سوچ اور ہمارے احساسات کا حصہ بن جاتا ہے۔

یہ "کوئی اور ستارہ" محض ستارہ نہیں ایک مکمل دنیا ہے، ایک پورا جہان ہے۔ وہ جو انگریزی کے کلاسیکی شاعر جان ڈن نے کہا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے اندر ایک جہان (آباد) ہے اور ہم میں سے ہر ایک (اپنے آپ میں) ایک جہان ہے، قطعی قابلِ فہم ہے۔ اصل مسئلہ تو اس جہان کی دریافت ہے، اس دنیا کی دریافت یا شاید اپنی دریافت، اپنا ادراک، اپنی پہچان، اپنا دیدار! عجیب مرحلہ ہے یہ، عجیب تمنا ہے:

پے بہ پے میں نے تمناؤں کو پیکر بخشے
اس تمنا میں کہ خود کو نظر آؤں کیسے!

....

غالباً اسی خواہشِ خود بینی کے تحت انسان نے پتھروں کو صیقل کیا تھا اور آئنہ بنایا تھا---اور پھر وہ عکس کی صورت اسی میں قید ہو کر رہ گیا تھا:

ٹھہر گیا ہے سرِ آئنہ مرا پرتو
مرے سوا کوئی شاید یہاں نہ رہتا ہو

....

پھر یوں ہوا کہ ایک دن آئنہ اس کے چہرے سے روٹھ گیا اور ایک چہرہ در بدر ہو گیا:

آئنہ روٹھ گیا چہرے سے
اس مکاں میں نہیں رہتا کوئی

....

اپنے چہرے کی اسی دربدری کے زمانے میں خود کو دیکھنے کے لیے اس نے یکسوئی کو ڈھونڈ نکالا۔ اپنے وجود کے اردگرد ایک دیوار کھڑی کر لی مگر یہاں اُس کا تعارف ایک اور دکھ سے ہوا:

پہلے دیوار اٹھائی تھی کہ خود کو دیکھوں
اب نہیں کوئی یہاں دیکھنے والا مجھ کو

....

چھپ جانے اور ڈھونڈے جانے کی خواہش بھی عشق کے جاں گسل مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے اور عشق کا ہر مرحلہ دکھ سے عبارت ہے۔ ہاں، دکھ دکھ میں فرق ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک اچھے فن کار اور ایک سچے فن کار کے دکھوں اور خوابوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک بہت لطیف سا فرق۔ جتنا بڑا دکھ ہوتا ہے اتنا بڑا خواب اور جتنا بڑا خواب اُتنی بڑی شاعری۔ اچھا فن کار نئی راہیں تلاشتا ہے جبکہ سچا فن کار نئی راہیں تراشتا ہے۔ اس کے بے چین دل میں ہمہ وقت ایک نئی جہت دریافت کرنے

کی، ایک ایسا نیا جہان آباد کرنے کی تمنا کروٹیں لیتی رہتی ہے جس کی کُل آبادی محض اُسی پر مشتمل ہو۔ ایک نئی سمت، ایک نئی راہ کی کھوج۔ شاید اسی اچھوتی تخلیقی راہ کو امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ نے استعارتاً "The Road Not Taken" سے تعبیر کیا تھا۔ اس خواہش کے حوالے سے جناب توصیف تبسم تو ہمیں ایک قدم اور بھی آگے دکھائی دیتے ہیں:

جہت اک اور جہاں میں ہوں، اور کوئی نہ ہو
اک اور سمت اسی چار سُو کے ہوتے ہوئے

اس بڑے تخلیق کار کی خواہش کے در پردہ مثبت اور تعمیری فکر کارفرما محسوس ہوتی ہے۔ وہ موجود کی نفی کر کے اپنی تمنا کا اثبات نہیں چاہتا۔ وہ وسعت کا، ترقی کا قائل ہے مگر اس کے لیے تباہ کن انقلاب کے بجائے تدریجی ترقی اور تبدیلی کا حامی لگتا ہے۔

افقِ خیال پر اسی نئی سمت اور ان جانی جہت کی تلاش کے دوران میں کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ تخلیق کار "کوئی اور ستارہ" دریافت یا تخلیق کر لیتا ہے جہاں ہر منظر اس کے وجدان اور مشاہدے کی تصویر ہوتا ہے۔ کبھی شام کی طرح دھندلا اور کبھی دن کی طرح واضح ---اور جہاں وہ کہہ سکتا ہے:

پھول ، خوشبو نظر آتا ہے مجھے

.....

اور:

سب سے اونچی شاخ پہ جیسے کھلتا پھول، پرندہ ہے

.....

جہاں:

آباد روشنی کا نگر پانیوں میں ہے

.....

اور کبھی وہ دیکھتا ہے کہ:

ہر کھڑکی میں پھول کھلے ہیں، پیلے پیلے چہروں کے

.....

اور یہاں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ:

دھوپ میں اس کے چہرے پر لٹ اور سنہری لگتی ہے

.....

سورج غروب ہوتے ہوتے شاعر کو ایک دل کش منظر سونپ دیتا ہے:

سورج ڈوب گیا ہے لیکن سارا دشت سنہرا ہے

.....

اور ایسے میں شاعر کو:

گھر تانبے کے لگتے ہیں اور جھیل سنہری لگتی ہے

.....

کیونکہ شاعر کے نزدیک یہ دن کی زرد آنکھ یعنی ڈھلتے سورج کے عکس ہیں:

پانیوں میں ڈوبتی جاتی ہے دن کی زرد آنکھ

.....

اس زرد آنکھ کے سنہری عکس سے تشکیل پاتے دل نشیں مناظر کو دیکھ کر شاعر اسے ایک عظیم مصور قرار دے دیتا ہے:

بڑا عظیم مصور تھا ڈوبتا سورج

....

تاہم شاعر کو شہر کے کچھ اداس اور بجھتے ہوئے روزن اب بھی عکس کے حسن سے محروم دکھائی دیتے ہیں تو وہ حیرت اور تشویش سے کہہ اٹھتا ہے:

شفق کے رنگ مگر بجھتے روزنوں میں نہ تھے

....

''کوئی اور ستارہ'' میں جا بجا اجاگر ہوتے شعری مناظر اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ شاعر کو فطرت سے بہت لگاؤ ہے- وہ اس کے مظاہر سے تحریک پاتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس کا گلہ مند بھی ہوتا ہے- صاف لگتا ہے کہ جبر اور محرومی اسے پسند نہیں- وہ چاہتا ہے کہ خیر اور حسن کی تقسیم کرتے ہوئے انسان ہی نہیں فطرت کو بھی لحاظِ مساوات رکھنا چاہیے- ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حسین مناظر سے لطف اندوز ضرور ہوتا ہے مگر ان میں کھو کر نہیں رہ جاتا- وہ زندگی کی علامت ان ابھرتے ڈوبتے مناظر کے ممکنہ اثرات اور آثار کو انسانی وجود اور اس کے اردگرد بکھری محرومیوں سے منسلک کر کے بھی دیکھتا ہے اور اس کے لفظوں کا موقلم خیال کے متنوع رنگوں کی آمیزش میں مصروف ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنے اظہار کے کینوس پر احساس کی کتنی ہی ان دیکھی داخلی تصویریں بھی ابھارتا چلا جاتا ہے-

کہیں کہیں تو وہ فطرت ہی نہیں قدرت سے بھی گلہ کرتا محسوس ہوتا ہے- اسے انسانی وسائل ہی نہیں بلکہ ادراک کی محدودیت بھی ناگوار محسوس ہوتی ہے- وہ حدِ بصارت سے آگے دیکھنا چاہتا ہے- دیوارِ ادراک سے ورا امکان کو جاننا چاہتا ہے- شاید اسی لیے ہستی کی کھڑکیوں سے دکھائی دیتے محدود آسمان اور ٹوٹتے ستارے کا منظر اسے اداس سا کر دیتا ہے:

محدود آسماں پہ، اک ٹوٹتا ستارہ!
ہر شب وہی ہے منظر، کمرے کی کھڑکیوں سے

....

یہاں ان کے ہم عصر احمد ندیم قاسمی صاحب اور ان کا دکھ کتنا مشترک لگتا ہے- ندیم صاحب کہتے ہیں:

میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں!

تاہم کبھی کبھی ہمارے شاعر کو یہ منظر بھی غنیمت لگتا ہے اُسے دیکھنے والی آنکھ کی طلب کا احساس بھی ہے اور منظر کی خواہش کا ادراک بھی- اسی لیے تو اسے یہ فکر بھی دامن گیر ہے:

منظر سے کیسے خواہشِ منظر جدا کریں!

....

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہ ''کوئی اور ستارہ'' ایک پورا جہان ہے جس میں سانس لیتے انسان ہیں، دھڑکتے ہوئے مناظر ہیں،

ڈوبتے ابھرتے دن رات ہیں، خوشیاں ہیں، غم ہیں، پرندے ہیں، پھول ہیں، پیڑ ہیں، راستے ہیں، دریا ہے، پانی ہے، دھوپ ہے، چھاؤں ہے، رنگ ہیں، آنسو ہیں، شور ہے، خامشی ہے، باغ ہے، صحرا ہے اور صحرا میں ایک بہت اہم کردار ہے: ایک البیلا، آوارہ بگولا--- شاعر کا ہمزاد بگولا، کبھی اس کے دوش پر اور کبھی اس کی آنکھوں سے وہ لمحہ لمحہ ستارہ گردی کرتا ہے۔ میرے خیال میں اس بگولے سے شاعر کی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ صحرا کے بلاوے پر وہاں پہنچا تھا:

--- کہ صحرا ہیں بلاتے مجھ کو

.....

آگے کا منظر کچھ یوں بیان ہوتا ہے:

وحشت میں جب ہاتھ اُٹھا کر میں نے رقص آغاز کیا
ایک بگولا اٹھ کر بولا : تجھ سے صحرا گرد بہت

.....

مجھے یاد آیا اس بگولے سے کچھ کچھ میں بھی واقف ہوں۔ اس سے میرا تعارف جناب یزدانی جالندھری نے بہت پہلے یہ کہہ کر کروایا تھا:

بگولوں کی حقیقت صرف اتنی سی ہے یزدانی
ہمارے دل کی وحشت دوشِ صحرا پر سوار آئی

.....

اب یہ بگولا ہمارے شاعر کو ستارے میں اُڑائے لئے پھرتا ہے:

راہ بے سمت ہے، اقتاد ہے منزل اپنی
خاک صحرا ہوں، اُڑاتا ہے بگولا مجھ کو

.....

دل چسپ بات یہ ہے کہ اس ہم سفری اور قرب میں انعکاسِ ذات وصفات کا عمل بھی رونما ہونے لگتا ہے اور شاعر دھیرے دھیرے خود بھی بگولا صفت سا ہونے لگتا ہے اور اسی تناظر میں وہ دوسروں کو بھی دیکھنے لگتا ہے:

مرا قدم ہی نہیں ہجر میں بگولا صفت
بچھڑ کے مجھ سے ترا غم بھی دربدر ہے بہت

.....

اب یہ بگولا صفت منظر منظر بٹی زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اُسے زندگی اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ اس ستارے پر جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ اب وہ فنی جبلت کے تحت ہمیں بھی اپنے مشاہدے اور تجربے میں شامل کرنے کا خواہاں دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہمیں کچھ ان الفاظ میں دعوتِ نظارہ دیتا ہے:

زمیں کے پھول، لب ورُخ کے استعارے ہیں
عجیب سیر ہے ، گھر سے نکل کے دیکھو تو

اور پھر کیا کیا منظر چشم تماشا پر کھلنے لگتے ہیں:

نظر کے سامنے اک خواب کا سا منظر ہے
ہَوا پکارتی ہے ، دشت بولتا ہی نہیں

.....

نشیمن میں ہے اک منقار و وحشت زدہ آنکھیں
دھواں پھیلا ہوا چاروں طرف جلتے پروں کا ہے

کھلا کہ خود ہی چمکتے ہیں ریت کے ذرّے
پسِ غروب بھی اک روشنی ہے ٹیلوں میں

....

سفینے ہو بھی چکے تہہ نشیں مگر دریا
سمیٹتا نہیں دامانِ پر شکن اپنا

....

شوقِ تعمیر بسائے گی خرابے کیا کیا
آدمی ہے تو ہر اک شہر میں صحرا ہو گا

....

اس سفر میں ایک مرحلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ کچھ منظر تو چشمِ تماشا پر ظاہر ہو جاتے ہیں مگر کچھ دکھائی دے کر بھی دکھائی نہیں دیتے۔ ابھرتے بھی ہیں تو ایک رمز کی طرح۔ ہمارا فن کار شاعر یہاں ہماری رہنمائی کے لیے کہتا ہے:

کسی منظر کا حصہ بن کے دیکھو
نہیں کھلتا نظارہ دیکھنے میں

....

اور پھر وہ خود بھی کبھی منظر بنتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی نظر — اور پھر ایسے لگتا ہے جیسے پل پل بدلتے ہوئے منظر، لحظہ لحظہ تبدیل ہوتی زندگی، ورق ورق کروٹیں لیتا اظہار، کینوس کینوس تغیر آشنا نقوش سے اس کا جی اوبھنے لگا ہو۔ یہاں ایک اور خواہش جنم لیتی ہے:

کوئی منظر تو اے دل! دائمی ہو

....

ہمارے شاعر کو اس ستارے کی سیر مکمل کرنا ہے، سفر مکمل کرنا ہے، مٹتے بنتے منظروں میں کسی دائمی منظر کو پانے کا سفر۔ اب اس کے سفر کی رفتار کا یہ عالم ہے کہ اپنا نقشِ پا اسے وجود سے کہیں آگے دکھائی دینے لگتا ہے:

کیا خبر لمحۂ موجود ہو فردا میرا
مجھ سے آگے ہے بہت نقشِ کفِ پا میرا

....

اس دوران میں جہاں وہ اور بہت کچھ پاتا ہے وہاں وہ موسموں کے دوش پر فطرت کا مقدس پیغام بھی پا لیتا ہے:

پڑھو، تمہارے لیے ہی شجر سے اترا ہے
ورق ورق یہ صحیفہ عبارتوں کے بغیر

....

اس صحیفے کو پا لینے کے بعد گویا اسے ایک دائمی منظر کی خبر مل جاتی ہے۔ اتنے رنگوں میں اسے ایک رنگ بھا جاتا ہے:

اتنے رنگوں میں کیوں تم کو، ایک رنگ من بھایا ہے؟

....

وہ خود سے، اپنے دل سے ہم کلام ہوتا ہے:

فقط جبیں کا لہو ہاتھ کا مقدر تھا
ہر ایک رنگ مری دسترس سے باہر تھا

....

اسی رنگ سے اس نے نقش کاری کا آغاز کر دیا:

اب ایک رنگ ہے تصویر ہو کہ پتا ہو

اسے شاید اپنی سمت دکھائی دینے لگی، نئی جہت نگاہ میں روشن ہونے لگی مگر اس کی انا کو ترک سفر قبول نہیں۔ کوئی سرگوشی کر رہا ہے:

پاؤں میں لپٹی ہوئی ہے سب کے زنجیرِ انا
سب مسافر ہیں یہاں، لیکن سفر میں کون ہے

.....

وہ اس سرگوشی کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتا جاتا ہے کیونکہ اسے بگولے کا چیلنج یاد ہے''۔۔۔ تجھ سے صحرا گرد بہت''۔

سو وہ پھر سے رقص آغاز کر دیتا ہے، پھر سے سفر جاری کر دیتا ہے۔ کہیں بیٹھتا نہیں، کہیں رکتا نہیں یہاں تک کہ وہ شکستگی کے باعث گر جاتا ہے۔ وہ اس شکستگی کا بھی ممنون ہے جس نے اس کے ہمت اور عزم کی لاج رکھ لی:

شکستگی کا بھلا ہو، سفر تمام ہوا
اگر نہ گرتا تو کچھ دیر بیٹھ جاتا میں

.....

انسانی عزم و ہمت کی شکست اسے قبول نہیں۔ اس کے تخیل کی یہ خواب ناک، پر تاثیر اور اور دل گداز ستارہ گردی بالآخر کنارِ دشتِ فن تمام ہوتی ہے جیسے ان دیکھے حُسن کی تلاش میں ٹینی سن کی '' The Lady of Shallott'' کا سفر برفیلے پانیوں کے اداس ساحلِ مقصود پر مکمل ہوتا ہے:

ان دیکھے ساحلوں کی لگن بھی عجیب تھی
سب کو خبر تھی جاں کا خطر پانیوں میں ہے

.....

تاریخ گواہ ہے کہ فن کا سفر ختم ہو کر بھی ختم نہیں ہوتا، منزل مل کر بھی نہیں ملتی، خواب پورا ہو کر بھی پورا نہیں ہوتا۔ ہونے اور نہ ہونے کا یہی تذبذب اور ادھورے پن کا یہی احساس فن کار کے اندر اس شوق کو پوری طرح زندہ رکھتا ہے جو اس کے سدا بہار تخلیقی سفر کا ضامن ہوتا ہے۔ جناب توصیف تبسم کی شاعری کا سفر ایک بھرپور اور زندگی افروز سفر نامہ ہے جو ہم سب کو'' کوئی اور ستارہ'' تخلیق کرنے کی تحریک دیتا ہے؛ ایک ایسا ستارہ جو ماضی کے دھندلے دھندلے منظر کی روشنی میں ہمیں حال کی روشن روشن تصویر بھی دکھائے اور فردا کے رنگا رنگ خواب بھی۔ جب تک کوئی اور ستارہ افقِ فردا پر روشن نہیں ہوتا آیئے ایک بار پھر جناب توصیف تبسم کے پر کشش تخلیقی ستارے کی سیر کر آتے ہیں۔

جی ہاں بالکل، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا وہاں:

مہکتے ہیں جہاں خوشبو کے سائے
تصور بھی وہاں تصویر سا ہے

☆☆☆☆☆

حامد یزدانی

حامد یزدانی اور میرا ناسٹلیجیا ایک ہی سا ہے، رنگ ڈھنگ، قُربت یہاں تک کہ عمر میں بھی۔ میں 1985 میں اپنی بستی چھوڑ کر لاہور آیا۔ حامد 1989 میں لاہور چھوڑ کر جرمنی اور پھر کینیڈا چلا گیا۔ اور اب بتیس برس سے وہاں ہے، میں پینتیس برس سے لاہور میں ہوں اچنبھے کی بات یہ نہیں کہ میں اتنے برس سے لاہور میں ہوں بلکہ حیرت کی بات یہ ہے حامد، اتنے برس سے لاہور میں نہیں، وہ لاہور میں نہیں، لیکن لاہور اُس میں ہے۔ لاہور، اس میں زندگی بھر رہے گا یہ نہیں کہ اس کی آنول نال اس شہر میں گڑی ہے بلکہ یہ اس شہر کی نشانی ہے کہ یہ آپ کے بھیتر میں کہیں گہرے مقام پر پنجے گاڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ آپ کی روح، آپ کے وجود میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ پہلے اس کے ہلکے رنگ اس کی شاعری میں ملتے تھے اب اُس کی کہانیوں میں اس کے بازار، اس کے در و دیوار اُس کے باغات، دروازے یہاں تک کہ کھانے میں در آتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کی ماں کی یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں، اُس کا بچپن اور لڑکپن آوارگیوں کی صورت میں اس کے رستوں پر بکھرا پڑا ہے جسے ماضی کی ہوا روز اڑائے اس تک پہنچاتی ہے۔ اگرچہ

زاہد حسن

پوری طرح واضح ہو کر یہ شہر اس پر نہیں کھلتا، جیسا کہ دھند، کہانی میں ہمیں نظر آتا ہے۔

''دھند میں لپٹا شہر یا شہر میں محصور دُھند
نہ سورج کا چہرہ دکھائی دیتا ہے، نہ لہور کا''

.....

حامد کے اس افسانوی مجموعہ میں سولہ افسانے شامل ہیں، وہ ہمیں اپنے ہر افسانے میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے لیکن ہر افسانے سے باہر اپنے کرداروں اور ان کے حالات و واقعات کو قابو میں رکھے۔ یہ سبھی کہانیاں اپنا خمیر ان جگہوں، لوگوں، موسموں اور ان حالاتوں سے اُٹھاتی ہیں، جو سمے کی صورت اس کی زندگی کی دہلیز سے ہو کر گزرے، اور سمے کے بے رحم تھپیڑوں نے انھیں دھول اور دھند کی صورت بہتے ساگروں کے سپرد کر دیا ہے۔ ان کہانیاں میں لاہور تو ہے، جرمنی، جرمنی کے شہر، یورپ اور پھر کینیڈا ___ اس دوران جن خطوں کے لوگ اس سے ملے اور مل کر بچھڑے، وقت اور لوگوں کے ذریعہ جو کہانیاں اور کردار اس سے ملے ان کی کہانیوں کا حصہ بنے، سب فطرتی طور پر ان کہانیوں میں بسیرا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی اس کی انفرادیت ہے۔ ایک طرف ''دیوار برلن، جرمنی کے اتحاد کا امین، برانڈن برگ گیٹ ہے، اور ایبٹ آباد، کے ایک گاؤں بانڈی ڈوراں کا فضل جو دیوار برلن کے ٹکڑے بیچ رہا ہے اور جو ٹکڑا مرکزی کردار لیتا ہو وہ وچھوڑے کی نشانی ہے، اور ایک اور ٹکڑا، جس پر ''گریہ'' درج ہے۔ یہاں دیوار، دراصل جدائی اور فراق کی علامت بن کر آتا ہے۔

اصل میں اس مجموعہ میں شامل سبھی کہانیاں بہت عمدگی اور من لگا کر ''بُنی'' گئی ہیں، اس لیے پڑھنے کے بعد ان سب کے اثرات تادیر رہتے ہیں۔ جیسے افسانہ ''چار سدہ'' بظاہر علمی اور لسانی مباحث کا حامل نظر آتا ہے۔ تاہم آخر آخر تک جاتے ہوئے یہ ایک عمدہ سپر نیچرل قسم کی کہانی بن جاتی ہے، جو ایک ٹرپ پر بس خراب ہونے، برگد کے نیچے چپل کباب کھانے اور اس کے پیسے ادا کرنے کے عمل سے جنم لیتی ہے۔ تاہم اس کا انجام بہت غیر متوقع ہے تاہم فکشنی نقطہ نظر سے بے حد منفرد ہے۔ دھمال بیک وقت مزنگ کے قبے پر عبداللہ شاہ پر اکٹھے ہوئے درویشوں کی دھمال سے کینیڈا میں مولانا روم کے مختص رقص درویش تک کے سفر کا احاطہ کرتے ہوئے کرداروں اور ماحول کا افسانہ ہے۔ اسی طرح

"فلسطین" اسماعیل حیدرآبادی، فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور ڈاکٹر وی اور اس کی بیوی اس کے ذریعے ہمیں ارضِ فلسطین تک تو گھما پھرا ہی لاتا ہے تاہم فلسطینی کے دہرے پن اس کی دہری شخصیت کی قلعی بھی کھول دیتا ہے۔

اس افسانے کی کتاب میں دو افسانے ہم پاکستانیوں کے لیے بھی بے حد اہمیت کے حامل ہیں "کو لیٹر" اور "خالی بالٹی"۔ دونوں گھر اور مہاجرت کے مابین کشمکش کو کھولتی کہانیاں، اُن بنگالی کرداروں کے حوالے سے جو اپنی ہندوستانی شناخت کو پہلے پاکستانی شناخت دیتے ہیں اور پھر کچھ ہی برسوں میں انھیں پاکستانی شناخت کو "بنگالی" شناخت میں تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران وہ جس نفسیاتی اور جذباتی بحران سے گزرتے ہیں، ہم ان کہانیوں میں تفصیل سے جانتے ہیں خاص طور پر "کو لیٹر" کی طلعت اور "خالی بالٹی" کے کریم بھائی، کس عمدگی سے حامد نے ان کرداروں کو گوندھ گوندھ کر نقش عطا کیے ہیں کہ اب یہ اردو ادب کے دائمی زندگی حاصل کرنے والے کردار تو بن ہی گئے ہیں، خود ہمارے لیے بعض تاثر بھی سوالات بھی کھڑے کر جاتے ہیں، جن کے جوابات ہمیں دینا لازم ہیں۔ ان افسانوں کے حوالے سے ایک نہایت اور دلچسپ بات کی ہے حامد کہتے ہیں، "اس افسانے کے شب و روز معمولات اور موسمی، ثقافتی، سیاسی، سماجی حالات اور ان کے اثبات پر تحقیق بھی ایک دلچسپ سفر تھا۔ وہ فرضی حوالے نہیں ہیں، ہاں کردار کچھ فرضی ہیں اور کچھ حقیقی۔

بعض کہانیوں میں تو حامد، بذاتِ خود ایک کردار کے طور پر در آتا ہے، جدید تھیٹر کی تکنیک کو برتتے ہوئے، ڈراما دیکھنے والوں کے مانند اپنے پڑھنے والوں سے مخاطب ہوتے ہوئے، ان کے افسانے کہانی میں اس کی واضح شکل دیکھی جا سکتی ہے، جس کو پڑھ کر ایک اور احساس بھی دامن گیر ہوتا ہے۔ بہ قول اُس کے اپنے "کہانی جاگ رہی ہے۔ کیونکہ کہانی کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ ہمیشہ کھلی رہنے والی آنکھیں، اور ان آنکھوں سے وہ لاہور کی شاہراہوں، کولون کے ریستورانوں اور دفتروں میں ملنے، اور مل کر بچھڑ جانے والوں کی حال حقیقت بیان کرتی رہتی ہیں۔

"رات" بھی اسی طرح کی ایک کہانی ہے۔ ماضی کے بستر پر اونگھتی ہوئی، یادوں کے عمدہ اور خوب صورت بیانیے۔ کینیڈا، جرمنی، نیو کیمپس، کالج۔ میرا ناسٹلجیا، اور کبھی کبھی تو یہ

ناسٹلجیا جینے کا اچھا خاصا نمونہ بن جاتا ہے۔ انہی کہانیوں کے مانند وہ اور وہ میں حامد نے کچھ لاہور اور کچھ کولون اور کچھ اپنے قریبی دوستوں کے نقش تخلیق کیے ہیں۔ اصل میں یہ سارے افسانے، ساری کہانیاں اُس کی اپنی آپ بیتی کے کچھ حصے ہیں۔ وہ رہ رہ کر اپنی کہانیوں میں پلٹتے ہیں۔ ماضی کی طرف پلٹنے کی وہی ازلی خواہش جو ہر انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

ٹیوب بھی ایسی ہی ایک کہانی ہے۔ ایسی بھی اور بہت حد تک مختلف بھی پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے والی وبا کے دوران وہ کس طرح جرمنی سے لندن آتے ہیں۔ اور ٹیوب میں سفر کے دوران بے شمار حادثات اور ان سے جڑے خدشات کو انھوں نے جس عمدگی کے ساتھ لکھا ہے قطعاً آسان نہیں ہوتا ایسا لکھنا۔ یوں تو لکھنا بھی کچھ آسان عمل نہیں۔ پھر خود ایک ہجرت کرنے والے کے طور پر مہاجرت، جلاوطنی اور پھر برسہا برس رہنے کے بعد بھی تارکین کے ازلی مسائل جو حل ہونے میں ہی نہیں آتے، اس کو "دروازہ" سمیت دیگر افسانوں میں بھی موضوع بنایا گیا ہے، دو افسانے جو ان موضوعات سے نسبتاً ہٹ کر ہیں، "مرغولے" اور "کوہے" ہیں۔ "کوہے" تو انسانی جبلت کے اُس گوشے کو وا کرتا ہے جو انسانی لاشعور میں خوابوں اور اندیشوں کی صورت میں ہمیشہ ادھ سویا، ادھ جگا رہتا ہے۔ خوابوں کی نیم غنودہ علامتوں کے ذریعے اسے خوب صورت طریقے سے بنایا گیا ہے، اور جہاں تک "مرغولے" کی بات ہے یقیناً اگر آپ لاہور میں رہتے رہے ہوں اور ادب سے ذرا مس رہا ہو، آپ حلقہ ارباب ذوق اور دیگر ادبی حلقوں میں آتے جاتے رہے ہوں تو یہ افسانہ آپ کو وہاں ہونے والی ساری کارروائی کا آنکھوں دیکھا حال سنا دے گا۔ اگرچہ افسانے کے اندر، افسانہ اور افسانہ نگار کا احوال بھی خوب ہے تاہم اس کا بیانیہ تو خوب تر ہے۔

حامد یزدانی کے ان افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات کی اور کہی جا سکتی ہے کہ اپنے موضوعات، زبان و بیان اور کسی حد تک تکنیک کے اعتبار سے ہم ہر اک جہان نو کے در وا کرتے ہیں، یہ جہان نو بظاہر ہمارے افسانہ نگار کے تجربہ اور مشاہدہ میں رہا ہے تاہم اب ہم بھی اس کے ذائقوں، لطفوں اور لطافتوں سے ہم آہنگ و ہم آشنا ہو سکتے ہیں۔"

☆☆☆☆☆

شکر گڑھ سے معروف شاعرہ و کالم نگار

محترمہ عظمت عظیم صاحبہ

چڑھتے سورج کی سر زمین شکر گڑھ ضلع نارووال نے بے شمار ذہین وفطین لوگوں کو جنم دیا انہیں میں سے اردو ادب کی دنیا کا ایک روشن و چمکدار ستارہ محترمہ عظمت عظیم صاحبہ ہیں۔ عظمتوں، رفعتوں بلندیوں، کہکشاوں رنگوں و روشنیوں والی آپاں عظمت عظیم اپنے نام اور کام دونوں حوالوں سے اسم بمسمی ہیں۔

آپ پیشے کے لحاظ سے ماہر تعلیم ہیں۔ آپ کا تعلق چڑھتے سورج کی سر زمین ضلع نارووال کی تحصیل شکر گڑھ سے ہے۔ جی ہاں وہی شکر گڑھ جہاں سے پاکستان کا سٹینڈرڈ ٹائم بھی لیا جاتا ہے۔ جہاں کے لوگ شہد اور شکر جیسے میٹھے ہیں۔ انٹرنیشنل باؤنڈری لائن بھی یہاں سے شروع ہوتی ہے کرتار پور گرونانک صاحب کا دربار بھی اسی تحصیل شکر گڑھ میں ہے۔

عظمت عظیم ایک باہمت اور پرعزم خاتون ہیں۔ وہ خداداد صلاحیتوں کی مالک ایسی تخلیق کار ہیں۔ جنہوں نے مضافات میں رہتے ہوئے علم وادب کے چراغ روشن کیے ہیں۔ اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس لو کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔ آپ کو کئی مواقعوں پر ادبی خدمات کے اعتراف میں سند، ایوارڈ، شیلڈز سے نوازا جا چکا ہے۔ عظمت عظیم ایک پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ خود عظمت عظیم نے چار ایم اے کر رکھے ہیں۔ ایم اے اردو، سیاسیات، ایجوکیشن، اور بی ایڈ۔ ایم ایڈ" آپ تعلیم کو پیغمبرانہ پیشہ سمجھتے ہوئے علمی کی روشنی سے ظلم اور جبر کے اندھیروں کو مٹانے کے مشن پر کاربند ہیں۔

آپ کو اپنی مٹی سے اپنے انسانوں سے بہت پیار ہے آپ نے شکر گڑھ میں (عظیم ٹرسٹ) کے نام سے ایک ادارہ بنا رکھا ہے جو غربت میں پسے ہوئے مفلوک حال غریبوں لاچاروں نادار لوگوں کی مدد کرتا ہے۔

عظمت عظیم باکمال کالمسٹ ہیں ---- وہ

خالق آرزو

مختلف اخبارات روزناموں اور میگزین وغیرہ میں لکھتی ہیں علمی اور ادبی قابلیت کی بناء ◻ پر ایک پختہ قلم کاروں میں ان کا شمار ہے۔ کہیں ادب دوست شخصیت اور کہیں کہنہ مشق کالم نگار کا خطاب مل چکا ہے۔ تو کہیں انہیں شکرگڑھ کے افق کا روشن آفتاب کہا گیا ہے۔ آپ کے کالمز باقاعدگی سے روزنامہ جہاں " روزنامہ نوائے آزاد" ریاست" دنیا " روزنامہ شفق" روزنامہ حریف" روزنامہ عظمت" نیا اخبار" روزنامہ ہوسٹ مارٹم "خبریں" اور کئی دوسرے اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اس کے علاوہ آپ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ اسپین کی شکرگڑھ سے نمائندہ خصوصی بھی ہیں۔ اور اردو ڈائجسٹ سے باقاعدگی سے آپ کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ عظمت آپاں ایک پرعزم کالم نگار اور شاعرہ کی حیثیت سے بطور خاص شہرت رکھتی ہیں۔ آپ کے کالم ملک کے طول و عرض میں ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اپ معاشرتی ناہمواریوں، ایوانوں میں ہونے والے جبر، سسکتی بلکتی انسانیت، مہنگائی، غربت وافلاس جیسے موضوعات پر دل کھول کر لکھتی ہیں۔ اور کیا خوب لکھتی ہیں۔ قلم میں روانی، فراوانی کے ساتھ پڑھنے والے کو لگتا ہے کہ یہ کالم تو میرے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں میرا دکھ اور درد بیان کیا گیا ہے۔ پڑھنے والے کو اپنی کہانی لگتی ہے۔ یہی کسی بھی لکھنے والے ---- کا کسی بھی شاعر کا اوج کمال ہوتا ہے۔ کہ اس کا ہاتھ معاشرے کی نبض پر ہو۔ اسے قلمی جہاد کہتے ہیں۔ یہ قلمی جہاد آپکا طرہ امتیاز ہے۔ انکے چند کالمز سے اقتباسات ---- برا کیا جو تیرے وعدے پر اعتبار کیا"

اصل میں اگر ریاست مدینہ کا لفظ استعمال نہ ہوتا تو آنکھوں میں اتنے خواب نہ بنے جاتے۔ جس طرح باقی لوٹ مار والے تھے انھیں بھی ویسا ہی سمجھ کر صبر کر لیتے۔ لیکن افسوس تبدیلی کی ایسی ہوا چلی کہ سب کچھ اپنے ساتھ اڑا کے لے گئی۔

ایک اور کالم سے اقتباس ------

"بھوک پھیرتی ہے میرے ملک میں ننگے پاؤں"

سڑکوں کے کنارے معصوم بچے، بچیاں پھول پکڑے بیچ رہے ہوتے ہیں۔ یہ عمر انکے کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔ معصوم بچیاں بڑے بڑے گھروں میں صرف دو وقت کی روٹی کے لیے غلامی کرتے زندگی گزار دیتی ہیں۔

یہ معصوم جنہیں تتلیاں پکڑنا تھیں جنہیں جگنوؤں کے دیس کی کہانیاں سننا تھیں جنھیں گڑیا کا بیاہ رچانا تھا جنہیں باغوں میں کھیلنا تھا ابھی کچھ پڑھنا لکھنا تھا تلاش رزق میں غم ہو گئے ہیں

اور " کبھی بن کے دیکھ رفوگر " سے

اقتباس -----

ہم سب جانے انجانے میں قینچیوں، چھریوں، چاقوؤں، خنجروں، کا کردار ادا کرنے کا فریضہ زبان کے سپرد کر چکے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا ہمارے الفاظ دوسروں کو کہاں کہاں زخم لگاتے ہیں زخم لگانے میں ہم اتنے ماہرانہ تراکیب لڑاتے ہیں کہ ہمیں کسی کی تکلیف محسوس تک نہیں ہوتی ہاں لیکن اپنے پہ لگے زخموں کے لئے ہم ہمیشہ کسی ماہر رفوگر کی تلاش میں رہتے ہیں۔

وہ ہمیشہ حقیقتیں لکھتی ہیں یہی انکا کمال اور شہرت کی وجہ ہے بڑی باریک بینی سے اخلاقی و معاشرتی مسائل کی نشاندھی کرتی ہیں کبھی "خانہ بدوشوں کی دنیا" کو سامنے لے آتی ہیں تو کبھی "اس زور پشیماں کا پشیماں ہونا" قاری کو ندامتوں میں مبتلا کر دیتی ہیں کبھی معاشرے میں پھیلی ہوئی "چلتی پھرتی محبتوں" کو بیان کرتی ہیں تو کبھی "مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تیرا عریاں ہونا" بنت حوا کی عریانیت پر شرمسار نظر آتی ہیں اور کبھی محب الوطنی میں وطن کے ترانے لکھتی ہیں۔

ہر تحریر میں سچائی اور حقیقت کا رنگ چھلکتا نظر آتا ہے معاشرے میں پھیلی برائیوں کی بڑے احسن طریقے سے نشان دہی کر کے مناسب حل پیش کرتی ہیں انداز بیان سادہ پر کیف قاری کے دل میں اتر جانے والا ہوتا ہے وہ ہمیشہ حقیقت کے قریب بلکہ حقیقتیں لکھتی ہیں۔

ان کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ موصوفہ کی ذہنی پختگی اور میچورٹی کس حد تک ہے۔ انھوں نے زندگی کے سلگتے ہوئے موضوعات کو اپنے تخلیقی رنگ میں رنگا ہے۔ تاہم انکی شاعری پہ انکے کالمز اور مضامین انکی تخلیقی اپج پر حاوی نظر آتے ہیں۔ وہ بات سے بات نکالنے اور بات کو دلیل سے کرنے کی ماہر ہیں۔ اور یہ انداز بیاں انکی فکری اور فطری جذبات کا غماز ہے۔ یعنی وہ اپنے موضوعات میں اس قدر کھو جاتی ہیں۔ کہ خود انکی کہانی روح میں اتر کر بہنے لگتی ہے۔ نتیجتاً قاری بھی بہاؤ میں آجاتا ہے۔ یہ حسن عمل بہت کم نثر نگاروں کے حصہ میں آتا ہے۔ موضوعات کا تنوع انکی دوسری اہم خوبی ہے۔ اگرچہ انکی نثر سادہ ہوتی ہے۔ لیکن سادگی میں بہت فکری اور جذباتی سلسلے رواں دواں نظر آتے ہیں۔ کالم کے بیان میں وہ کبھی کبھار ایسی پھلجھڑی بھی چھوڑ جاتی ہیں۔ کہ قاری ایک لحظہ کے لیے رک کر اس پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور یہ کسی بھی کالمسٹ کے لئے غیر معمولی بات ہے عظمت آپاں کے کالموں میں ایسی غیر معمولی باتیں آپکو جگہ جگہ دیکھنے کو ملیں گی۔

اب آتے ہیں انکی شاعری کی طرف۔ وہ ایک محبت کرنے والی اور چاہتیں بانٹنے والی بہترین انسان ہیں۔ وہ خود بھی بے ساختہ ہیں۔ اور ایسی ہی بے ساختگی انکی شاعری میں بھی ملے گی۔ اپنی باطنی ذہانتوں کے ساتھ وہ ایک فطری شاعرہ ہیں۔ خود بھی علم و عرفان کی تانیں اڑاتی ہیں۔ اور علم و ادب سے کرنیں بکھیرنے والے لوگ پسند ہیں۔ انہیں اقبال کا شاہین اور شاہین کی بلند پروازی پسند ہے۔ انکی سوچیں ہمیشہ تازہ رہتی ہیں۔ اس لیے انھیں ترسیل کا مسلہ درویش نہیں۔ انکی یہ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

"ضدی سوچیں"

سوچیں ضدی بچے جیسی ہوتیں ہیں
یہ کچھ بھی سمجھ نہیں سکتیں
راتوں کو اٹھ اٹھ روتیں ہیں
آنسو یوں بہاتی ہیں جیسے کوئی موتی ہیں
سوچیں ضدی بچے جیسی ہوتیں ہیں
دنیا والوں سے چھپ چھپ کے
ہجر و فراق میں روتیں ہیں
پیار محبت عشق و وفا کے
دل میں بیج بوتیں ہیں
سوچیں ضدی بچے جیسی ہوتیں ہیں
نفرت کی آگ میں جل جل کے
پھر ابدی نیند سوتیں ہیں
چاہت کے دل کش رنگ سجا کر
آنکھوں میں خواب پروتیں ہیں
سوچیں ضدی بچے جیسی ہوتیں ہیں

.....

وہ کبھی مایوس اور نا امیدی کا شکار نہیں ہوتیں ان کی ایک اور نظم ملاحظہ فرمائیں

"روشن سویرا"

کڑوی یادوں کا تسلسل اور
رات کا پچھلا پہر
اک خواب اچانک جاگتا ہے
میں دیکھتی ہوں ادھر
اک ستارہ تیز چمکتا ہے
ہر سمت روشن کر دیتا ہے
اک موہوم سی امید دیتا ہے
عذاب رت عذاب دن مستقل نہیں رہتے
رات جتنی بھی کالی ہو
اپنے پیچھے سویرا لے کے آتی ہے

.....

عظمت آپا نے عصری مسائل اور حالات حاضرہ کے حوالے سے بھی نظمیں کہی ہیں۔ ان کے کلام میں سنجیدگی اور دردمندی دیکھنے کو ملتی ہے۔ عظمت عظیم کے کالمز اور شاعری اس بات کی گواہ ہے۔ کہ وہ بڑے شوق اور محنت سے اپنا سفر جاری رکھنے پر پختہ یقین رکھتی ہیں۔ جو امید افزا ہے۔ انکے اس پختہ یقین میں ہم بھی شامل ہیں اور ان کی مزید کامیابیوں کے لئے دعا گو ہیں۔

☆☆☆☆☆

لفظوں کے کچھ پھول

پچھلے تیس برس میں، میں نے
گئے ہوؤں پر لکھے کالم
کل یونہی جب جمع کیے تو کیا کیا چہرے
بھیگتی آنکھوں کے صحرا میں پھیل گئے

یک دم جیسے یادوں کا اک میلہ سا آباد ہوا
ایسی تھی وہ بھیڑ کہ مجھ کو سچ مچ گنتی بھول گئی

گئے ہوؤں کی قبروں پر
یہ پھول چڑھانا واجب تھا پر
جتنی اُن کی یادیں ہیں اب
اتنے پھول کہاں ہوتے ہیں
کب یہ دردیاں ہوتے ہیں

سونے جیسے ان لوگوں سے پھر سے ملنا
اور اک ایسی بھیڑ میں ملنا
روکے سے جو رُک نہ سکے اور پل پل بڑھتی جاتی ہو
بام فلک پہ جیسے ہر سو
رنگوں سے معمور ستارے جگ مگ
جگ مگ کرتے ہوں
اور آنکھ سنورتی جاتی ہو

ایسا اک احساس تھا جس کی
ٹھنڈک بے اندازہ تھی
رنگ محل میں کھلنے والا
جیسے اک دروازہ تھی

لیکن اس سے کہیں زیادہ
اُن کی آنکھوں میں لہراتی
وہ گہری تسکین تھی جس سے سارا منظر مہک رہا ہے
ہر اک چہرہ دمک رہا ہے
”مے خانہ وہ اب بھی کھلا ہے
جس میں وہ خود ساقی ہیں
اُن کی یاد میں جینے والے
لوگ ابھی تک باقی ہیں“

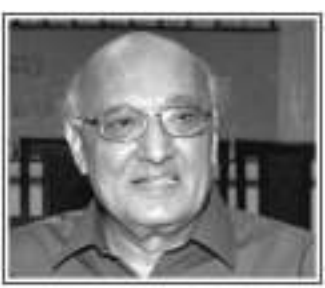

امجد اسلام امجد

منظوم تراجم

کوئی دروازہ "شخصیت" کی چابی کھول سکتی ہے
مگر اس کو کھلا رکھنے
دوبارہ بند ہونے سے بچانے کا
بس اک رستہ ہے دنیا میں
وہی رستہ، جسے ہم آپ سب "کردار" کہتے ہیں

George Washington

اگر موقع نہ دے دستک
تو بہتر ہے نیا دروازہ بنواؤ

کسی کی آدھی بیماری وہیں پر ختم ہوتی ہے
اگر اُس کے
دُکھوں کی بات کوئی دھیان سے سُن لے!

ہے افضل تر زمانے میں
یہی صورت معافی کی
کہ جب تم لے سکو بدلہ
کسی قبضے میں آئے بے کس و مجبور دشمن سے
نہ کوئی ہاتھ ہو جب تم کو اس سے روکنے والا
تو تم خود سے معافی دے کے
رستہ چھوڑ دو اُس کا

حضرت امام حسینؓ

جو کوئی "غیر معمولی" کسی امکان کی خاطر
نہیں لیتا کبھی خطرہ
تو پھر اُس کو
بہت "معمولی" چیزوں پر گزارا کرنا پڑتا ہے

امجد اسلام امجد

توبہ!

جلیل عالی

گلوبی ابتلا کی
موت پالی، دل ہلاتی دہشتوں میں
خلق استغفار کرنا چاہتی ہے
اپنے خالق سے
معافی مانگنے کی بات کرتی ہے
تو غصّے سے بھنویں تانے
نکل آتی ہیں باہر
کس لئے آنکھیں تمہاری
کیوں زبانیں
آگ کے گولے اگلتی ہیں
تم ایسے تیر برساتے ہو طعنوں کے
کہ جیسے سامنے انساں نہیں
احساس سے محروم
کوئی اور ہی مخلوق ہو
ساری کتابیں بھول بیٹھے
فرد کی آزادیوں والی
گنوا دی سوچ ہریالی
تمہارے حال پر
آئین اور تہذیب کے
سب فلسفے روتے ہیں
فسطائی رویے اور کیا ہوتے ہیں!

حساب

ایک اک پل ہمارے جیون کا

آگ سے کھیلتے گزرتا ہے

خواہش و خواب و اضطراب کی آنچ

ڈستی رہتی ہے سانپ کی صورت

زہر محرومی و فلاکت کا

کاٹتا ہے رگ دل و جاں کو

آتشِ حسرت و تاسف سے

جلتے رہتے ہیں روز و شب اپنے

مت ڈراؤ ہمیں جہنم سے

اس سے بڑھ کر عذاب کیا ہوگا

دے چکے امتحان ہم کتنے

اب ہمارا حساب کیا ہوگا

گلزار بخاری

آ _ مرا خواب ہو

زمانے!
تری آنکھ میں بھی کوئی خواب ہے یا نہیں
کرب کی زرد آندھی نے
میری تو دونوں ہی آنکھوں میں
مٹی اُڑائی ہُوئی ہے
مرے راستے میں تو دُنیا ہی آئی ہُوئی ہے
عجب بھیڑ ہے
خواب کے قافلوں کی عجب بھیڑ ہے
ہر طرف اِک الاؤ جلا ہے
کہیں کوئی شعلہ
کہیں بس دھواں اُٹھ رہا ہے
کبھی اِس طرف کو جو تو آن نکلے
مرے دِل کے صحرا کا منظر
تجھے جانے کیسا لگے گا

زمانے!
مرے دِل کے صحرا میں آتے ہُوئے رُک نہ جانا
برستی ہُوئی ریت کے بادلوں سے پرے
ایک شاداب خطہ بھی ہے
جس جگہ
اپنے خوابوں کو مَیں نے چھپا رکھا ہے
تجھ کو جس کا پتہ بھی بتا رکھا ہے
آ _ مرے دِل میں آ
خوابِ چمن
آنکھ کو نیلگوں بیکرانی سے آباد کر
دِل کا صحرا مسرت کے پانی سے آباد کر
مجھ کو سیراب کر، خود بھی سیراب ہو
مَیں ترا خواب ہُوں، تُو مرا خواب ہو

خاور اعجاز

کہاں جاؤں

مجھے اپنے لیے اک گھر بنانا ہے
کہ اب سرکار کی جو نوکری ہے چھٹنے والی ہے
پرانی گلیوں میں واپس چلا جاؤں
یہ جی تو کرتا ہے لیکن
وہاں سے تو جڑیں ہی ایسی اکھڑی ہیں
وہ مٹی اجنبی نظروں سے مجھ کو گھورتی ہے
اور مری پہچان سے انکار کرتی ہے
مرے بیٹے نے جو نقشہ بنایا ہے
تو اس میں کوئی ڈیوڑھی ہی نہیں ہے
(اب کہیں تعمیر کی ہر ممکنہ صورت میں ڈیوڑھی کا
تصور ہی نہیں ملتا)
نہ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی ہے
(کہ اب المونیم کا دور دورہ ہے)
نہ کوئی طاق ہے اس میں، نہ پڑچھتی دکھائی ہے
رسوئی ہے!
(کچن کہتے ہیں اب جس کو)
مگر اس میں برادے والی انگیٹھی کہاں رکھیں
بھلا مرمر کے شیلفوں پر
گئے وقتوں کی فرسودہ سی چیزیں کون رکھتا ہے
نہ کوئی کوٹھڑی ہے
فالتو اشیا کو جس میں ٹھونس کر رکھتے ہیں
موٹا سا کوئی تالا پڑا ہوتا ہے
ٹیڑھے، چرچراتے نم زدہ در پر
کوئی خاموشیوں میں اونگھتا دالان بھی اس
میں نہیں شامل
جو آتی جاتی آہٹ سے اچانک چونک جاتا ہو
وہاں میں اجنبی ٹھہرا
یہاں بیتا ہوا منظر نہیں ملتا
کہاں جاؤں!

طالب انصاری

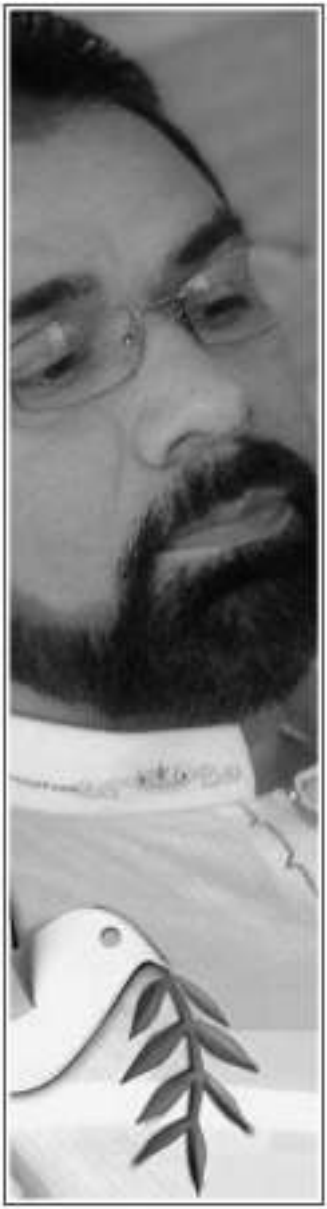

انتظار

پیپل کے پتوں پہ لکھا
پیغام خزاں کا
راہ کی پیلی گھاس سے، حامد
پُھوٹ رہی ہیں کلیاں
آنکھیں ہیں یا گلیاں!
خواہش ہے یا رستہ؟
دُور کہیں لے جائے گا
جلتی ہتھیلی پر کِھلتا
اکتوبر کس کو بھائے گا!
دل میں پھر
اپریل کہیں سے لوٹ کے آئے گا

اکتوبر

پت جھڑ کی یہ پہلی بارش
آج پرندے نظم کرے گی
دن بھر
پیلے پتوں پر

حامد یزدانی

جس کو احمد فراز کہتے ہیں [احمد فراز کے لیے نظم]

جس کے شعروں میں دل دھڑکتا تھا
جس کی باتوں میں رنگ ہوتے تھے
اُس کے لفظوں کے دائرے اندر
ان گنت تتلیاں بھی ہوتی تھیں
پھول ، خوشبو ، ہوا ، سبھی موسم
دسترس میں وہ اپنی رکھتا تھا
حرف اُس کے غلام تھے سارے
وہ اُنھیں دم بدم پرکھتا تھا
ظلمتوں کے خلاف بھی اُس نے
روشنی کے پیام لکھے تھے
جو صفِ دشمناں میں رہتے ہیں
ایسے لوگوں کے نام لکھے تھے
عام لوگوں میں خاص تھا کوئی
زندگی کی اساس تھا کوئی
اُس کی یادوں میں ہم بھی رہتے ہیں
جس کو احمد فراز کہتے ہیں

محمد نوید مرزا

میکڈونلڈ کے مضافات میں

شبہ طراز

کھنکتے قہقہوں کی گونج تھی
اور پانچ کا سکّہ،
لکیروں کی پکڑ سے
خود بخود ڈھیلا ہوا
اور گر پڑا---
انگلیوں کا لمس
اپنی خودستائی کی پریشاں سوچ
میں کاغذ کے ٹکڑوں پر مچلتا ہی رہا۔
پہیہ بنا--- وہ پانچ کا سکّہ
اکیلے راستے پر دور تک چلتا گیا---
اک غول ننگے اور بھوکے
نیند کے مارے ہوئے بچوں کا لپکا
اک تصادم زور کا،
اور ایک ہاہا کار---
اک بڑی گاڑی کا ہارن،
اور چمکتا پانچ کا سکّہ

گٹر کی گاد میں گُم۔
اور بھوکے ننگے بچے دھینگا مُشتی کے
پرانے کھیل میں مشغول۔
ٹوٹا تھا جہاں سے زندگی کا سلسلہ
پھر جُڑ گیا---!

نامیہ کے لیے

لگانا پڑتا نہیں تل کوئی بھی گال کے ساتھ
خدا نے خلق کیا ہے تجھے جمال کے ساتھ

زمین ناچ اُٹھے اور ستارے رقص کریں
قدم اُٹھا کے تُو چلتی ہے سُر کے تال کے ساتھ

ترے خرام سے ہر مورنی نے سیکھا ہے
کہ کیسے گھنگھرو چھنکتے رہیں گے چال کے ساتھ

تو میری آنکھ کا سب سے حسیں نظارہ ہے
دکھائی دیتی ہے مجھکو گلوں کے جال کے ساتھ

اے مری راجکماری مری فرشتہ صفت
غرض تجھے ہے جواہر سے اور نہ مال کے ساتھ

میں تجھ سے آنکھ ہٹاؤں تو پھر پلٹتی ہے
میں دیکھتی ہوں تجھے خود بھی احتمال کے ساتھ

تو اپنے دل کی کہانی عیاں نہیں کرتی
سجا کے رکھتی ہے کانٹوں کو اپنی ڈال کے ساتھ

نہ جانے کون سی مٹی سے تُو بنی ہوئی ہے
حیات اپنی بسر کرتی ہے کمال کے ساتھ

مہکتے پھولوں سی کومل تو حد سے نازک ہے
ہوا تو اس کی طرف دیکھنا خیال کے ساتھ

تو نظرِ بد سے بچے تجھ سے ہوں بلائیں دور
نشاط اور فزوں تر ہو ماہ و سال کے ساتھ

اب ایسے گوہر نایاب ہو چکے ناپید!!
ذرا سنبھال کے اے وقت دیکھ بھال کے ساتھ

محبتوں کا سماں چاہتوں کا ابرِ رواں
یہ سب عنایتیں ہوتی ہیں خال خال کے ساتھ

رخشندہ نوید

امرتا پریتم

وقت کے اندھے کنویں کو دیکھا
بھیگی آنکھ سے اُس نے
ننگے پاؤں صحراؤں کو ناپنے وہ نکلی تھی
اور دریا کے پار بھی اتری اک اک موج کے ساتھ
پلک پلک میں بھری ہوئی اک اشکوں کی برسات
دیکھے کون اِن آنسوؤں کی بارش
کا گرتا پانی
دل آہوں کی روانی
وہ پنجاب کے دکھ کی ماری
ہجر میں اُس نے عمر گزاری
سینے بھر کر ریت!
دکھ کے گھونٹ بھرے تو گلے میں اٹک گئی اک چیخ
نوکِ زباں پر
سسکی جیسے بھٹک رہے کچھ راز،
ٹوٹے پنجھی کے کسی پر کی آئی تھی آواز
اُس نے چاہا لاکھ کہ پلٹے پیچھے
ان رستوں کو
اور وہ دیکھے دروازوں پر اپنے پیارے
روتے کچھ ہنستوں کو
لیکن کبھی وہ پلٹ نہ پائی
کھلا ہوا تھا در
اُس کا خالی گھر!

رخشندہ نوید

خواب در خواب

چل رہی ہے بڑے انداز سے آہستہ خرام
لگ رہا ہے ترے کوچے سے صبا آئی ہے
یوں مہک اُٹھا ہے گھر کا میرے گوشہ گوشہ
جیسے اُٹھ کر ترے پہلو سے بہار آئی ہے
پھول چن کر ترے پہلو سے ابھی لائی ہے
کس نے دیکھا ہے کہ تارے بھی چمک اُٹھے ہیں
چاند بھی جیسے سرِ بام اُتر آیا ہے
ایک منظر جو تہہِ خواب تھا آسودہ کہیں
اب حقیقت کی طرح مجھ کو نظر آیا ہے
خواب در خواب پسِ عکس جو منظر ابھرا
لاکھ چاہوں بھی تو اب آنکھ نہیں کھل سکتی

راجہ عبدالقیوم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روپ کو دھن جانا تو من میں لوبھ گھنیرا پھیل گیا
دریا دریا، صحرا صحرا، دامن میرا پھیل گیا

نثری نظم

تپتی ریت پر برہنہ پا سفر زیست ہے رواں دواں
خواب دریدہ چشم نم اپنی بے حوصلگی کو اگر
دلاسا دے بھی تو کیا
چہار سو تاریکیاں ہیں
اور شہر دل میں سرگراں کچھ خواب
بے نشاں منزلیں ایسے نگر کا پتا ڈھونڈتی ہیں
جہاں حیات گلاب ہو
اس شہر پرہجوم میں اک بھی چہرہ ایسا نہیں جو پورا ہو
مصلحتوں کے پیچ وخم میں الجھے ہوئے لوگ
ہیں
جانتے ہیں سچ ہے کیا
پھر جانے کیوں خاموش ہیں
منظر کی بدصورتی دلیلوں سے چھپ سکتی نہیں
رویوں کی بدصورتی کو لاکھ خوبصورت لفاظی
کا ملبوس اوڑھا دیں
انکی بدنمائی نمایاں رہتی ہے
زندگی سچ اور جھوٹ کے کھیل میں الجھ کر
ہزار ہا ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے
کوئی بھی چہرہ مکمل نہیں دکھتا
جب مصلحتوں کے سیسے سے کان بند
ہوں تو درد کی چیخیں سینے میں ہی گھٹ رہ
جاتی ہیں
تعفن زدہ سوچیں لے کر ماحول کو آلودگی
سے بچانا غیر ممکن ہے
سچ کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھنے کا
حوصلہ ہو تو منظر کی بدنمائی واضح ہو
" آنکھ تو وہی دیکھتی ہے جو اسے سوچ کی
بینائی دکھاتی ہے"

نائیلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیے کا دم کہیں اٹکا ہوا ہے
سو، مشکل ، بھیڑنا پٹ کا ہوا ہے

آہٹیں واہمہ ہیں

ہمنوا سوچنے تو دے مجھ کو
ہمنوا سوچنے تو دے مجھ کو
کس کی خوشبو فضا میں پھیلی ہے
کون دیتا ہے دستکیں در پر
کس کے لہجے کی دلنشینی کا سحر طاری ہوا سماعت پر
عہدِ ماضی کے آشیانے سے
فاختائیں حسین یادوں کی
ذہن کی ملگجی فضاؤں میں پر کشا ہو گئی مسرت سے
آہٹوں دستکوں کی شدت سے
روح بیتاب ہوتی جاتی ہے
ہمنوا سوچنے تو دے مجھ کو
ہمنوا سوچنے تو دے مجھ کو
سانس بے ربط ہوتی جاتی ہے
دھڑکنیں تیز تر ہیں سینے میں
گزرے لمحوں کی شمعیں روشن ہیں
وسوسے ڈھل گئے تیقن میں
پھر بھی مجھ کو یقیں نہیں آتا
میرے اندر سے کوئی کہتا ہے
آہٹیں دوست بھی ہیں دشمن بھی
آہٹوں کا نہ اعتبار کرو
اکثر اوقات یہ بھی دیکھا ہے
آہٹیں واہمہ بھی ہوتی ہیں
ہمنوا سوچنے تو دے مجھ کو
ہمنوا سوچنے تو دے مجھ کو

خالق آرزو

غمگسار سے آخری درخواست

اگر ہو سکے تو ذرا اپنے سامان میں دیکھنا
میری نظمیں
مرے ساتھ چلتے ہوئے روز و شب شاعری
میری نیندیں
مرے خواب
تمہارے کسی بیگ میں تو نہیں رہ گئے
اگر ایسا ہے تو ذرا
کسی آتے جاتے کے ہاتھوں
مرے ساتھ چلتے ہوئے روز و شب
میری نیندیں، ادھوری سی نظمیں جو تم بن ادھوری رہیں
میرے خواب اور ٹوٹے ہوئے خواب کی کرچیاں
کھلکھلاتی ہنسی اور ادھورا لطیفہ
اُداسی میں لپٹی ہوئی چند شامیں
مجھے بھیج دینا
کہ میں ایسے رستے پہ ہوں
جس کے دونوں طرف بس اُداسی ہے تنہائی ہے
اور شانوں پہ رکھا ہوا فاصلہ بڑھ رہا ہے مسلسل بڑھے جا رہا ہے

اعجاز رضوی

خطوط

آصف ثاقب

جدید تر ادب کے بیاض، تاب محترم عمران منظور

السلام علیکم!

''بیاض'' ستمبر آج دل کا سرور آنکھ کا نور بن کر آیا۔ گویا صبر کا امتحان نہیں لیا۔ اپنے تو بقولے وارے نیارے ہو گئے۔ ''بیاض'' کے ''معیارِ ادب'' سے جی خوش ہوتا ہے۔ معمول کے مطابق خالد احمد کا کلام شروع میں باعثِ صد مسرت ہوا۔ خالد آپ جانیں ہماری شاعری کے بلند و بالا ستون ہیں۔ انھوں نے شعری ڈکشن کو حسنِ بیاں کا ایسا تمول بخشا ہے کہ دیکھا چاہیے۔ کیا خوب کہا ہے:

میں کہ مفہوم ہوں پہنائی کا
وسعت سمجھیں نہ سمندر مجھ کو

جشن آزادی کے خصوص میں رانا محمد شاہد کے جذبات دل کو لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ''یہ آزادی ناچنے گانے اور بیہودہ حرکتوں سے نہیں ملی تھی بل کہ اس کے لیے ہمارے اجداد نے خون کے دریا عبور کیے تھے۔ ہمارے ہاں آج بھی ایسے بزرگ موجود ہیں جنھوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ رانا صاحب کو معلوم ہو میں نے تحریک پاکستان کی مبارک سرگرمیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ میں اس وقت لڑکائی میں تھا۔ بزرگوں کی قربانیاں مجھے کل کی طرح یاد ہیں۔

محترم سید ریاض حسین زیدی نے بڑی محبت سے مجھے اپنے پروقار خط میں مذکور کیا، ان کے الفاظ میرے لیے ایک سرٹیفکیٹ سے کم نہیں۔ آفتاب احمد ملک کے ظرف عالی سے میں ہر بار مستفید ہوتا ہوں۔ اب کے بھی ملک صاحب نے مجھے عزت دی ہے۔ نسیم سحر صاحب میرے دل کے خوب صورت باشندے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی سے دن کٹ رہے ہیں۔ کتاب ''پاکستانی ادب کے معمار'' اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کی ہے۔ یہاں کی تقریب میں موجود کتابیں ختم ہو گئی ہیں۔ اس کی اشاعت میں اکادمی کے اختر رضا سلیمی، میر نواز سولنگی اور چیئرمین اکادمی ڈاکٹر یوسف خشک نے دلچسپی لی اور مجھے اعزاز بخشا۔ کتاب اکادمی سے مل سکتی ہے۔

نسیم سحر مشہور و معروف صاحبِ قلم ہیں۔ اکادمی والے انھیں کتاب تحفے کے طور پر دیں گے۔ ''بیاض'' کی سبھی تحریریں حسن و خوبی سے مزین ہیں۔ آغا گل کے افسانے ندرت اور جدت کے مرقع ہوتے ہیں۔ گوہر رحمٰن نوید کی تحریر سے بہت خوشی ہوئی۔ کلیم خارجی کا شمار پسندیدہ اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔ سیدہ آمنہ ریاض نے ''لطف نگاری'' میں ایک خصوصیت پیدا کر لی ہے۔ شاعر امروز کا سلسلہ خوب ہے۔ یہاں سے ایک ایک شعر لکھتا ہوں:

میں آپ اپنے اندھیروں میں بیٹھ جاتا ہوں
پھر اس کے بعد کوئی شے چمکتی رہتی ہے
سالم سلیم

کسے رہائی کی اب ضرورت
بہار پنجرے میں آ گئی ہے
حسن ظہیر راجا

جمیل یوسف

مکرمی! السلام علیکم!

ستمبر کا "بیاض" یکم ستمبر کو ملا۔ ایسی باقاعدگی اور بروقت آمد کا مظاہرہ کم ہی کسی ادبی جریدے نے کیا ہوگا۔ ماشاء اللہ۔

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے کوئی شعر مشکل سے ہی پسند آتا ہے۔ کراچی کے مشہور و معروف شاعر جناب سحر انصاری نے مجھے اپنا مقبول عام شعر سنایا:

عجیب ہوتے ہیں آداب رخصتِ محفل
کہ وہ بھی اُٹھ کے چلا جس کا گھر نہ تھا کوئی

اور داد طلب نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے عرض کیا: "حضور! شعر غلط ہے۔ حقیقت اور صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ کیا جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا وہ محفل کے اختتام پر اُٹھ کر رخصت نہیں ہو جاتا کیا وہ وہیں بیٹھا رہتا ہے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ جناب سحر انصاری کے منہ سے نکلا "مروادیا"۔ یہ 23 مئی 2014 کی بات ہے جب جناب عطاء الحق قاسمی نے لاہور میں پانچویں الحمرا ادبی کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ جس زمانے میں قتیل شفائی (مرحوم) مشاعروں میں ترنم سے اپنی غزلیں سنایا کرتے تھے اور محفل میں چھا جایا کرتے تھے ایک مشاعرے میں اپنی مشہور زمانہ غزل کا جادو جگا رہے تھے۔

حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں ۔۔۔ اُن کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

اس میں ایک شعر ہے:

اُف وہ مرمر سے تراشا ہوا شفاف بدن ۔۔۔ دیکھنے والے جسے تاج محل کہتے ہیں

مشاعرے کے بعد میں نے حضرت قتیل شفائی سے پوچھا: "جناب! کیا آپ کی محبوبہ ایک مزار ہے؟ جو اسے تاج محل کہہ رہے ہیں۔ وہ مجھے دیکھتے رہے۔ بولے نہیں۔

میں کیا کروں جو اشعار پڑھنے سننے کو ملتے ہیں ان میں سے 80 فی صد اشعار میں مجھے کوئی نہ کوئی سقم یا نقص فوراً نظر آ جاتا ہے۔

میرا ایک شعر ہے:

طلب کی راہ میں اک یہ بھی حادثہ گزرا ۔۔۔ ہم اپنے ذوقِ نظر کا وقار لے کے چلے

غالب بہت بڑا شاعر ہے۔ شاید خیال کی پرواز اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے دنیا کا کوئی اور شاعر اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ مگر مجھے شکایت یہ ہے کہ صاف شفاف دودھ میں مینگنیاں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس طرح کے اشعار کیوں کہے اور اگر کہے تھے تو انھیں شاملِ دیوان کیوں کیا؟

کیوں ردِ قدح کرے ہے واعظ ۔۔۔ مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
ہے خبر گرم ان کے آنے کی ۔۔۔ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

مندرجہ بالا ذکر میں نے اس لیے چھیڑا کہ اکثر احباب مجھ سے ناراض رہتے ہیں کہ میں اُن کے اشعار کیوں کوٹ نہیں کرتا۔ یا ان کی شاعری پر مضمون کیوں نہیں لکھتا۔ اپنی مجبوری یا معذوری بیان کرنا مجھ پر قرض تھا۔

اب 'بیاض' کے زیر نظر شمارے کی طرف آتا ہوں۔ بڑی مدت بعد مجھے حمد کا کوئی شعر پسند آیا ہے۔

اندھیری رات کی پرچھائیوں نے رقص کیا
خدا کی یاد کا میں نے دیا جلایا ہے
آصف ثاقب

یہ سچ ہے بلندی پہ ترا عرشِ بریں ہے
ہم نے تو جہاں تجھ کو پکارا، تو وہیں ہے
حسن عسکری کاظمی

اور اب تجلّۂ غزل

ارزانی سی ارزانی تھی
سانجھ سویرے، بال بکھیرے
ہم تو کوچا پڑھ پڑھ روئے

پیار کا بول تھا مول تمھارا
ڈھونڈ رہے ہیں ایک سہارا
اور کوئی نے محل اُسارا
خالد احمد

مجھ کو پھر شوق سفر ہے کتنا
آپ کے ساتھ جو ہو لوں تو کہوں
ہجر کا روگ کڑا ہے کتنا
دل کے سب راز میں کھولوں تو کہوں
آصف ثاقب

صحرا اور سمندر میں جو بن جاتا تھا سمت نما
وہی ستارا دشتِ الم میں دل کا ساتھی ٹھہرا ہے
سب کو امجد گھیر رکھا ہے، اپنے اپنے مطلب نے
کس کی آنکھیں اندھی ہیں؟ اور کون یہاں پر بہرا ہے؟
امجد اسلام امجد

چشمِ نم تو ہے وہی لیکن ضیا کچھ اور ہے
زخمِ تازہ پر نمک کا ذائقہ کچھ اور ہے
اب نہیں حسرت گزیدہ آنکھ سے محوِ دعا
اس کو آنکھوں ہی سے جینے کی دعا کچھ اور ہے
سامنے ہر پل نصابِ زیست ہے لیکن ہنوز
پڑھ رہا ہوں اور کچھ لکھا ہوا کچھ اور ہے
رفیع الدین راز

گھونگرو دیکھتا ہے، رقص کا ڈھب دیکھتا ہے
دیکھنے والا کہاں اس کا سبب دیکھتا ہے
نیند میں خواب کا منظر تو سبھی دیکھتے ہیں
جاگنے والا مگر خواب عجب دیکھتا ہے
اعجاز کنور راجہ

کسی عشق میں مبتلا آدمی ہوں
تو مطلب یہ ہے، لادوا آدمی ہوں
دوبارہ کوئی چاک پر رکھ دے مجھ کو
شکستہ ہوں، ٹوٹا ہوا آدمی ہوں
نہ جانے میں کب مار ڈالوں گا خود کو
نسیمِ سحر، سر پھرا آدمی ہوں
نسیم سحر

زین کس رکھی ہے اور باگ پکڑ رکھی ہے
کون کہتا ہے کہ میں چلنے کو تیار نہیں
کس لیے پھرتی ہے دنیا مرے آگے پیچھے
اس سے میں بات بھی کرنے کا روادار نہیں
خاور اعجاز

آتے ہیں نظر اب تو پرندوں کی جگہ پر
اڑتے ہوئے پتے خس و خاشاک خدا خیر
اس حسن سے بپھرے ہوئے لشکر کے مقابل
میں اور مرا پیرہنِ صد چاک خدا خیر
راحت سرحدی

خوب ہے گیت سا پیکر اس کا
خوب ہے اس کے سراپے کی غزل
کچھ غزل اس نے لکھی رومانی
اور کچھ اپنے عقیدے کی غزل
ممتاز راشد لاہوری

کتنی آسانی سے کہسار اٹھا لیتا ہوں
میں ترے عشق کا آزار اٹھا لیتا ہوں
اک جھلک میں جو میسر نہیں ہوتی طالب
سر پہ کوچۂ دل دار اٹھا لیتا ہوں
طالب انصاری

کھل گئی اپنے آپ پہ جب میں
منکشف تو بھی ہو گیا مجھ پہ
زندگی کی غزل ادھوری ہے
کتنا بھاری ہے قافیہ مجھ پہ
ہجر میں کیسی ہو گئی حالت
طنز کرتا ہے آئنہ مجھ پہ
لیلیٰ صفدر

ارادہ باندھ سفر کا یقیں کی چادر میں
وہ ایک خواب کسی تہ میں بھی کہیں رکھ دے
زمیں کی چیز ہیں سب احتیاج کی باتیں
ترا سفر ہے جدا زادِ رہ یہیں رکھ دے
قدم قدم پہ سرائے ملے گی رکنا نہیں
شبِ وصال کی حسرت دلِ حزیں رکھ دے
شازیہ اکبر

سب سے آواز ملاتا ہوا میں
خود سے جھگڑے کو بڑھاتا ہوا میں
کتنا منہ زور نظر آتا ہوں
مال کمزور کا کھاتا ہوا میں
اپنی سانسوں کو امر کرتا ہوا
ریت پہ نقش بناتا ہوا میں
اکرم جاذب

وہ جو خوابوں کے سلسلے تھے میاں
کیسے بن کر بکھر گئے تھے میاں

تم خریدار ہی نہ تھے ورنہ
ہم تو بے دام بک رہے تھے میاں
اذنِ قربت میں کتنی دیر ہوئی
ہم تو صدیوں سے جا چکے تھے میاں
رخسانہ بیمن

تیری قربت کی جستجو کی ہے
کیا عجب دل نے آرزو کی ہے
میں نے خود کو اگر نہیں بدلا
ترک کب تو نے اپنی خو کی ہے

بس اتنی ہی غزلیں دیکھ سکا ہوں۔

نسیم سحر

برادرم عمران منظور - سلام مسنون۔
حسبِ معمول بیاض کا شمارۂ معتبر بروقت مل گیا۔ ماشاءاللہ سرورق کے اندر دونوں جانب تازہ کتابوں کی تصاویر دینا ایک مثبت روایت ہے جس سے بیاض کے قارئین کو کتابوں کی اشاعت کی اطلاع بھی ملتی رہتی ہے۔
اس مرتبہ غزلوں اور نظموں کا حصہ بڑا بھرپور ہے اور بہت سے اشعار پسند بھی آئے ہیں لیکن اب ان بہت سے اشعار کو خط میں لکھنا میرے لیے کارِ محال ہے۔ حمد و نعت کے حصے میں بھی اس مرتبہ ڈاکٹر ریاض مجید سمیت سبھی حمد و نعت نگاروں نے اپنی تقدیسی شاعری کے جوہر خوب دکھائے ہیں۔ مختصراً کچھ چنیدہ اشعار لکھ رہا ہوں:

حمدیہ:

مرے مکان میں توحید کی فضیلت ہو
مری دعا میں یہی التجا خدایا ہے
آصف ثاقب

کرم خاص کہ آنت نکل آئے اس سے
ہے زوال آشنا ذہنوں میں جو وحشت وحشت
ڈاکٹر ریاض مجید

تو ہر جگہ موجود ہے کیا شان ہے تیری
فرمان ہے تیرا کہ تو شہ رگ کے قریں ہے
حسن عسکری کاظمی

یہ توحید ہی روحِ انسانیت ہے
ریاضِ عمل ہے اسی سے دلآرا
سید ریاض حسین زیدی

سوچ تیری جدا ہے مگر مجھ سے
کیوں پھر اتنی بھی گفتگو کی ہے
نائیلہ راعجور

پہلے پہلے پیار کا موسم تھا جذبات نشیلے تھے
ہم تھے، تم تھے، برکھا رت تھی، شام کے ہونٹ رسیلے تھے
جیسے وقت بدل جاتا ہے ہم بھی بدلے بدلے ہیں
جاناں! کچھ دن پہلے تک ہم بانکے اور سجیلے تھے
ایک طوفانی بارش میں جبران ملے تھے ہم دونوں
من کے اندر شعلہ تھا اور تن پر کپڑے گیلے تھے
وسیم جبران

اس کا عصیاں شعار بندہ ہوں
جس کے رحمت شمار سے باہر
سرور حسین نقشبندی

نعتیہ:

ہے شب کا نصف، سعیِ نعتِ سرور کر رہے ہیں
ورق، گلزار تنہائی منور کر رہے ہیں
ریاض مجید

لبیں قمر ڈھونڈ نیا نعت قرینہ
لکھ اسمِ نبیؐ غایتِ غایات رقم کر
محمد لبیں قمر

مجھ میں کب تھا اپنے رب کو جاننے کا کچھ شعور
آپؐ سے میں نے یہ نعمت پائی، اے ختمِ رسلؐ
خاور اعجاز

شاملِ حال رحمت خدا کی ہوئی نقشِ پا ہیں نبیؐ کے یہاں پر
مجھ پہ کھلتا گیا راستہ نعت کا یہ مدینہ ہے، بچ کر ذرا چل

حامد یزدانی ذکی طارق

نثر میں جناب سلیمان عبداللہ ذار کی تحریر نے روح و دل کو معطر کر دیا۔ ان کے اس عارفانہ و فلسفیانہ مضمون کا آغاز نٹشے کے ایک نثر پارے کے اس جملے سے ہوتا ہے "ہر درد بیدرد ہوتا ہے"، اور پھر اس کے آگے اس کی شرح کے ساتھ ساتھ جس انداز سے ملحقہ کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے وہ کوئی صاحبِ معرفت ہی کر سکتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے کہ "درد کا سفر بندے کے اندر کا سفر ہے، محبّ کے قلب و نظر کا سفر ہے جس میں دنیا اور اس کے تعلق کو غبارِ راہ یا نقشِ کفِ پا کی صورت چھوڑنا ہوگا"۔ یہ ایک ایسی تحریر ہے جسے ایک مرتبہ پڑھ کر سیری نہیں ہوتی، اور جتنی بار اسے پڑھا جائے دل پر ایک نئی کیفیت طاری ہوتی اور تحریر کے نئے نئے معانی روشن ہوتے ہیں۔

خالد احمد کے نعتیہ مجموعے "تشبیب" کا فکری، اشتقاقی و عددی مطالعہ سیدہ آیت گیلانی صاحبہ کے قلم سے مسلسل دیکھ رہا ہوں اور یقیناً یہ خالد احمد کی کثیر الجہت شاعری کا احاطہ کرتی ہے۔ میں ان کے مضمون کی ہر قسط کی خواندگی کے ساتھ ساتھ اسے محفوظ بھی کر رہا ہوں تاکہ مکمل صورت میں اسے دوبارہ پڑھا جائے کہ جزوی سے کلی کی جانب سفر بھی لازم ہوتا ہے۔

افسانوں میں دردانہ نوشین خان کا "ہبت خلیفہ" ایک نادیدہ مخلوق سے ملاقات کی پُر تجسس کہانی ہے جس کی یہ آخری تین لائنیں کہانی کو عمدگی سے سمیٹتی ہیں اور قاری کا تجسس سمٹنے کی بجائے پھیل جاتا ہے: "انسان ہے؟" وہ (اروما) تھوک نگل کر بولی۔ "نہیں۔۔ انسان نہیں ہے۔" "میں غافری طرح مسکرائی۔ اب بخار چڑھنے کی باری اروما کی تھی۔ دردانہ نوشین خان آج کل جس انداز کے افسانے لکھ رہی ہیں ایسے بہت کم لکھے جا رہے ہیں۔ جناب کلیم خارجی نے بھی ایک حساس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور عیسائی بھائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے مجموعی منفی رویے کو حقیقت بیانی سے موضوع بنایا ہے۔ آغا گل تو ہر افسانے میں کمال کر دیتے ہیں "گیدڑ سنگھی" میں بھی ان کا یہی کمال درجۂ عروج کو پہنچا ہوا ہے اور قاری روایتی گیدڑ سنگھی کی کہانی پڑھتے پڑھتے فضل کے گھر میں دھن برسا دینے والی "گیدڑ سنگھی" کی حقیقت تک پہنچتا ہے تو اس گیدڑ سنگھی کے خاوند فضل کی جبلی نااہلی کے ساتھ ساتھ اس کی بیوقوفی یا سادگی پر بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

جناب شاہد ماکلی کو سلام کہ انہوں نے اپنے دو مختصر مضامین میں ایک ہندوستانی شاعر "سالم سلیم" اور ایک پاکستانی شاعر حسن ظہیر راجہ کا تعارف بھی کرایا اور ان کے منتخب اشعار بھی ہمیں پڑھنے کو دیے۔

دو طنزیہ و مزاحیہ مضامین "چچیدہ کی فضیلت" اور "شوقیات" کوئی خاص متاثر نہیں کر سکے۔ ممکن ہے میری حسِ مزاح کو ہی ان دنوں کچھ ری چارج ہونے کی ضرورت ہو۔

ڈاکٹر نثار ترابی نے جس عالمانہ اور عمدہ تحقیقی انداز میں ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی مثنوی "کتاب نامہ" کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے وہ ایک ایسی عمدہ تحریر ہے جس سے ایک طرف تو ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے قلم کے کمالات اور موضوع پر گرفت کے زاویے روشن ہوتے ہیں اور دوسری طرف نثار ترابی کی تحقیقی و ادبی گہرائی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ دونوں میرے قریبی احباب میں شامل ہیں اور دونوں کو میری طرف سے بہت سی داد۔

جناب یوسف عالمگیرین نے "کتاب دوستی" کے عنوان سے بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو اُن کے مطالعے میں آئیں اور یہ مضمون پڑھنے کے بعد مجھے بھی خواہش ہوئی کہ یہ سب کتابیں حاصل کروں اور ان کا مطالعہ کروں۔ خوش قسمتی سے ان میں سے جناب جبار مرزا اور ڈاکٹر صفدر محمود کی کتابیں تو میں حاصل کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی بھی بہت سی کتابیں میرے پاس ہیں مگر اس مضمون میں ان کی جن کتابوں کا تذکرہ ہے وہ ابھی تک مجھے نہیں ملیں۔

خطوط میں جناب آصف ثاقب صاحب کا ہمیشہ کی طرح سرِ فہرست شائع ہونے والا خط واقعی سرِ فہرست ہونے کا مستحق تھا۔ جناب محمد ارشاد نے اپنے خط میں رباعی کی صنف پر اہم باتیں کی ہیں۔ انہوں نے بیاض کے گزشتہ شمارے میں شائع ہونے والی کچھ رباعیوں کو وزن سے خارج قرار دیا ہے۔ دراصل رباعی کہنا ہر شاعر کے بس کا کام بھی نہیں ہے۔ جناب جمیل یوسف

میرے کشمیر اور مجھ پر مہربان دوست اور شاعر ہیں۔ انہوں نے فون پر اگست کے شمارے کے بارے میں انہیں تفصیل نہ بتا سکنے پر جو میری سرزنش کی ہے، سر تسلیم خم ہے، تاہم میرا خیال ہے اب ستمبر کے شمارے میں میرا خط پڑھ کر وہ مطمئن ہوگئے ہوں گے۔ ویسے بھی گذشتہ دو تین مہینوں سے ہر ملاقات میں یا ہر فون کال پر وہ میری آنکھوں کی صورت حال کے بارے میں پوچھتے ہیں، تو انہیں اب سمجھ آگئی ہوگی کہ میں ان کی ایک غزل کو بیاض میں لوکیٹ کرنے میں کیوں ناکام رہا۔ پھر بھی اُن سے معذرت، اس وعدے کے ساتھ کہ آئندہ میں اچھا بچہ بنوں گا۔

ممتاز راشد لاہوری

محترم عمران منظور / محترم اعجاز رضوی (مدیران "بیاض" لاہور)

السلام علیکم!

"بیاض" (ستمبر 2021) بدست ڈاک نظر نواز ہوا۔ حسب روایت خوبصورت نثر پاروں اور شعری تخلیقات سے مزین شمارہ ہے۔ آغاز ہی میں خالد احمد کی غزل نے دامن دل کھینچ لیا۔ کیا خوبصورت اشعار ہیں۔ حمدوں میں آصف ثاقب، ریاض مجید، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، حامد یزدانی اور سرور حسین نقشبندی کا کلام لاجواب ہے۔ ان میں سے بعض کی نعتیں بھی خوب ہیں۔ رباعیات و قطعات والا حصہ بھی بھرپور ہے۔ گلزار بخاری کا "گیت" اور افروز رضوی کے ہائیکو بھی کمال کے ہیں۔ سیدہ آیت گیلانی نے خالد احمد کے نعتیہ مجموعہ "تغزیب" کا عمدہ جائزہ لیا ہے۔ دردانہ نوشین خان کا افسانہ "جنت خلیفہ" پُراسراریت کا عمدہ آئینہ دار تھا۔ آغا گل کے افسانے "کیوز منگھی" نے بھی خوب لطف دیا۔ شوکت علی شاہ کی "شاہ داستان" حسب معمول دلچسپ جارہی ہے جبکہ رخشندہ نوید بھی اپنی ادبی زندگی کے واقعات بطریق احسن بیان کرتی چلی آرہی ہیں۔ غزلوں کا حصہ کافی ضخیم ہے۔ ابھی کوئی دس بارہ غزلیں ہی پڑھی ہیں اور خوب لطف لیا۔ آپ نے میری غزل بھی شامل کی ہے جس کے لیے سپاس گزار ہوں۔

آفتاب احمد ملک

برادر محترم و محتشم عمران منظور صاحب! آداب!!

ماہنامہ "بیاض" ستمبر 2021 یوم دفاع بروقت موصول ہوا۔ یاد آوری کے لیے احسان مند ہوں۔ حمد و نعت کے بعد سلیمان عبداللہ عذار کا روحانی موضوع "درد بیدرد" پڑھا۔ نثری شاعری کا مرقع (شاہ داستان) شاہ صاحب نے لاہور کارپوریشن کی اندرونی و بیرونی عجیب و غریب کہانیوں سے محظوظ کیا۔ بیوروکریسی کی حکومتی چالوں پر دلیرانہ شکوہ و شکایات پر مختصراً جائزہ پیش کیا۔ (صفحہ نمبر 73-82)

"یادیں" کے حوالے سے محترمہ رخشندہ نوید صاحبہ کا سفرنامہ حج کی روداد قسط #2 یہ کہاں نصیب میرے روحانی مناظر کی منظر نگاری ہے اور شاعر دو کا تذکرہ بھی۔ (صفحہ نمبر 83-89) __ ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ (7) مضامین مختلف علمی و ادبی موضوعات پر شامل اشاعت ہیں۔ یوسف عالمگیرین جن کا ایک قومی ماہنامہ سے بھی تعلق ہے۔ موجودہ حالات کے تناظر میں دلچسپ موضوع "کتاب دوستی" پر خاصا معلوماتی و دلچسپ اظہاریہ تحریر کیا۔ وطن عزیز کی 9 معروف مصنفین کی تصنیفی خدمات کا تحریراً اعتراف کیا اور ان کی شخصیت و کتب پر جاندار مختصر تبصرہ جات بھی۔ (صفحہ 203-20) دیگر مضمون نگار احباب نے نصرارت + شوکت کمال رانا + افضل خان + عباس تابش + ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد + جمشید اعظم چشتی + مولانا وحید الدین سلیم کی ادبی خدمات و کتب پر تبصرہ جات کیے۔ اس طرح قارئین ادب کی ذہنی لائبریری میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ نیز سیدہ آیت گیلانی

صاحب کا تحقیقی و دینی مضمون بعنوان خالد احمد کے نعتیہ مجموعہ ''تشبیب'' پر عالمانہ تبصرہ خوب ہے خصوصاً ''طلسم حروف'' (صفحہ نمبر 34 تا 37) راقم کی حروف مقطعات پر کتاب زیر ترتیب ہے ایک مستند حوالہ علامہ غضنفر عباس تونسوی ہاشمی کا مل گیا ہے۔ البتہ علامہ عبدالعزیز دباغ کی ''الابریز'' اردو ترجمہ (2006) اور علامہ ثاقب اکبر صاحب کی ''حروف مقطعات مختلف آرا مطالعہ (2016) بھی خاص اہمیت کی کتب ہیں۔۔۔ (5) افسانہ نگار خواتین و حضرات) نے افسانوی رنگ خوب ابھارا ہے معاشرتی زندگی میں عمومی رویوں اور حالات حاضرہ پر کڑی ضربیں بھی لگائی ہیں۔ اپنے اپنے زاویوں سے افسانہ نگاری کی ارتقائی منازل طے کرنے کے لیے کن کٹھن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً آغا گل کے افسانوی سطور نے گرفت میں رکھا۔ (کیڈر سنگھی) غربت کسی جادوگرنی کی جھاڑو کی طرح ساتھ ساتھ اُڑتی پرتی...... (صفحہ نمبر 59) بعض دل جلے

تو ہی کیڈر سنگھی کہتے۔ (صفحہ نمبر 62) اقتدار کی دیوی کو ہند کلب میں رہتی تھی تالے کے اُس پار...... (صفحہ نمبر 63)

غزل گو شعرا کا کلام تازہ پڑھ کر تحریری داد نہ دینا ادبی گراوٹ ہے۔ غزلیات میں نئے الفاظ کا استعمال اور تشبیہات و استعارات کا کمال نظر آتا ہے۔ بعض اشعار کافی بھاری و معنی خیز ہیں انتخاب خاصا مشکل ہے چند درج ذیل اشعار پڑھے اور ادبی ریکارڈ ڈائری میں بھی نوٹ کیے:

کس نے بنایا شہر ہمارا
ظلم کی اینٹیں، جبر کا گارا
راہ گزارو، لاکھ پکارو
پلٹ چکا ہے، وقت کا دھارا
خالد احمد

شعر کہنے دو سکوں ہو کر مجھ کو
میں ذرا دیر کو سوال تو کہوں
آصف ثاقب

سب کو گھیر رکھا ہے، اپنے اپنے مطلب نے
کس کی آنکھیں اندھی ہیں؟ اور کون یہاں پر بہرا ہے
امجد اسلام امجد

رشتے ناتے، آشنائی، قربتیں اپنی جگہ
آدمی سے آدمی کا رابطہ کچھ اور ہے
رفیع الدین راز

دعا کے ساتھ دوا بھی تو چارہ گر کیجیے
وہ بے خبر کہ دیکھے نہ حسرتوں کے نشاں
حسن عسکری کاظمی

میرے لفظوں کے دیے کچھ بھی نہ کام آ پائے
لوگ کہتے رہے تقریر دھواں دھار نہیں
خاور اعجاز

بس اک نقطہ موہوم ہوں ریاضی کا
نہ کوئی عرض ہے میرا نہ طول ہے میرا
محمد ارشاد

اب جھجکتی سوچوں کے خالی کاسے بھر جائیں گے
کرنیں بانٹ رہے ہیں اندر کے چمکیلے موسم
سید قاسم جلال

جلال شاہ سے مرعوب ہو نہیں سکتا
فقیر بات کرے گا انا کے لہجے میں
باقی احمد پوری

میری پہچان بنے گی اک دن
بکھرے بکھرے ہوئے لہجے کی غزل
ممتاز راشد لاہوری

میں اس کی چھاؤں میں اکثر کتابیں پڑھتا ہوں
شجر یہ گھر کا ہے مجھ کو نہال رکھتا ہے
ہارون الرشید

مٹا پہلے تو ظلمت ہر طرف سے
بڑے پھر شوق سے جشن سحر کر
جسارت خیالی

یہاں امیر و وزیر دیکھے کبھی صغیر و کبیر دیکھے
انا کا جو بھی امیر دیکھا وہ خواہشوں کا غلام دیکھا
اقبال سروبہ

بارشیں نہیں ہوتیں اُس کے گھر میں رحمت کی
جس کسی کے آنگن میں بیٹیاں نہیں ہوتیں
ریاض ندیم نیازی

اب شاعری میں اور کسی کو بھی دیں جگہ
مجذوب و مست و فقر و قلندر نکال کر
ارشاد نیازی

(11) خطوط میں شامل ''بیاض'' میں محترمہ دردانہ نوشین خان صاحبہ کی سطور اندرونی کرب وغم کی عکاس ہیں۔ بشیر و وبھوئی کا سانحہ انتقال۔ غائب و حاضر میں کافی فرق ہے۔ ادبی برادری آپ کو عزت و توقیر سے دیکھتی ہے۔ ''بیاض'' کے حساس قارئین دلی طور پر غائب شدہ تخلیق کاروں کے متلاشی ہیں۔ صفحات سے غائب یا دنیا سے اگلی دنیا۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ کل تک جو ''بیاض'' کی زینت تھے آج ہم میں نہیں ہیں۔

رونقیں شہر کی مدفون ہیں ان قبروں میں
سو گئے ہیں مری آنکھوں میں مناظر کتنے؟

ربِ کریم فوت شدہ افراد کو غریقِ رحمت کرے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین ثم آمین!!
اندرونی صفحات پر 8 نئی کتابوں کے رنگین سرورق دیکھ کر قلبی مسرت ہوئی۔ اشاعت پر دلی مبارکباد!!
241 صفحات پر مشتمل ادبی جریدہ کی ترتیب و انتخاب مضامین و شاعری پر انتظامیہ کی شبانہ کاوشوں کو سراہنا ادبی فریضہ ہے۔ یومِ دفاع پاکستان کے موقع پر محمد نوید مرزا کے اشعار پسند آئے:

یوم دفاع ملک منانے کے واسطے — پرچم کو رفعتوں پہ اڑان کے واسطے
روحیں یہ کہہ رہی ہیں شہیدانِ قوم کی — ہو جاؤ ایک ملک بچانے کے واسطے

حاجب انصاری

مکرمی عمران منظور صاحب
بہت احترام اور مسنون سلام
''بیاض'' کا شمارہ بابت ستمبر 2021 نظر نواز ہوا۔ جذبات تشکر قبول فرمایئے
حسبِ سابق رسالہ وقیع مندرجات سے مزین ہے۔ رسالہ کو اچھے لکھاریوں کا تعاون حاصل ہے۔ اللہ کرے خالد احمد کے لگائے ہوئے اس سرسبز پیڑ پر کبھی خزاں نہ آئے۔
دردانہ نوشین خان افسانہ کو ایک نیا رنگ دے رہی ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ''حطہ'' ناول کی اشاعت کے بعد ان کا غالب رجحان تصوف کے معاملات کی طرف ہو گیا ہے۔
زیرِ نظر پرچہ میں موجود ان کا افسانہ ''بنتِ خلیفہ'' ایسے رجحان کا ہی غماز ہے۔ میں اگر اس افسانہ کا فکری تجزیہ کروں تو افسانے کا ہیرو، جو لوگوں کی موجودگی میں صرف افسانہ کی ہیروئن کو نظر آ رہا ہے، کسی خیال یا فکر کی تجسیمی شکل ہے۔ ایک علامت ہے جو ہیروئن کو صوفیانہ مسلک کی جانب بلا رہی ہے، اور اس راستے پر چلنے سے ہی افسانے کی ہیروئن کو سلوک کی راہ میں اعلیٰ منزل مل سکتی ہے، جسے افسانے کے عنوان ''بنتِ خلیفہ'' سے ظاہر کیا گیا ہے۔ افسانے میں ایک موڑ ایسا بھی آتا ہے۔ وہ تجسیمی شکل خود کو غیر مرئی مخلوق کے طور پر ظاہر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ میں بشر نہیں ہوں۔ زمین پر آدمؑ کو خلیفہ بنایا گیا تھا۔ اس کا کام تھا کہ ہمیں علم آشنا کرتا۔ ہماری تربیت کرتا۔ اے بنتِ خلیفہ کیا تم نے یہ کردار ادا کیا؟؟ اس افسانے کی گرہ اس طرح کھلتی ہے کہ تخلیق کار ابنِ آدم کو خلیفہ اور بنتِ آدم کو بنتِ خلیفہ کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند ہے۔ دردانہ نوشین خان افسانے کی بُنت کا فن جانتی ہیں اور ایمائیت سے بھرے اس افسانے میں بھی وہ کامیاب ٹھہری ہیں۔
آغا گل کا افسانہ ''ہیڈ منگھی'' نہایت دلچسپ افسانہ تھا۔ ان کے افسانوں کا یہ اختصاص ہے کہ افسانے کی تخلیق میں وہ دلچسپی کا عنصر کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اختتامیہ پر قارئین کو حیران چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کے افسانے قارئین کو اس طرح گرفت میں رکھتے ہیں کہ آخری سطر تک قاری افسانے کے انجام کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

''یادیں'' کے ضمن میں رخشندہ نوید صاحبہ کی دلچسپ اور ایمان افروز باتیں پڑھنے کو ملیں۔ سید شوکت شاہ صاحب بھی ہمیں ''آپ بیتی'' کے زیرِ عنوان دلچسپ باتوں میں شریک کرتے ہیں۔ شاعر امروز از شاہد مالکی بھی اچھا سلسلہ ہے۔ سیدہ آیت گیلانی بہت عرق ریزی سے خالد احمد کے قصائد کا فکری و ادبی جائزہ لے رہی ہیں۔ مکتوبات میں محمد ارشاد صاحب کا خط علم افروز تھا۔ سب کے لیے کلماتِ تحسین شاعری سے دلچسپی دو چند ہونے کے ناطے شعری تخلیقات سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ آزادی کے حوالے سے جمیل یوسف، اقبال سروبا کی نظمیں اچھی لگیں خاور اعجاز صاحب کی نظم نے بہت متاثر کیا۔ زیرِ نظر پرچہ میں جمیل یوسف صاحب نے نظمیہ صورت میں بانیٔ پاکستان کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ قائداعظم کے ساتھ ان کی عقیدت مثالی ہے، جو ان کی تحریروں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ غزلیں بہ قدرِ ظرفِ ہر کس عمدہ تھیں ایک نظم ''بیاض'' کے لیے ارسال ہے۔

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب

السلام علیکم

ستمبر کا شمارہ ملا، مطالعہ جاری ہے۔ مجموعی طور پر حسبِ سابق غزل و نظم اور نثری تحریروں پر مشتمل ہے۔

شروع میں حمدیہ اور نعتیہ کلام کے گلدستے خوشبو بکھیرتے ہیں۔ بقول ذکی طارق:

آج مضطرب ہے بہت ہی کرلیں آ ذکرِ صلِ علیٰ چل

بقول سرور حسین نقشبندی:

ذہن جب نعت کے انوار میں کھو جاتا ہے اک اجالا مرے اطراف میں ہو جاتا ہے

پہلے صفحے پر خالد احمد کی غزل کا مطلع ایک یاد کی کیفیت سے بھول جانے کے کرب کی سمت اشارہ کرتا ہے

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

آغا گل کا افسانہ 'گیدڑ سنگھی' فضل کے کردار کو سامنے رکھ کر دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ ایک مخصوص دور سے اور لوگوں سے وابستہ چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے جادو نگری سجائے ہوئے لوگ۔ کچھ سطور دیکھیے

گیدڑ سنگھی مل جائے تو سارے دلدر دور ہو جائیں۔

سمجھو کہ لاٹری نکل آئی ہے۔

کیا جادو ہے۔ دیکھے بغیر ہی رشتہ طے ہو گیا۔

ہاتھ کی لکیروں اور ستاروں کی چال سے قسمت ہی بتا دیں۔

اس کا مرنی زائچہ پیدائشی ہونا چاہتا تھا۔

آپ سے تو فال نکالنے والا طوطا ہی بہتر ہے۔

فرحت پروین کا افسانہ ''آخری ٹکا'' بدلتی ہوئی صورت حال بیانیہ ہے۔ لبنیٰ مقبول کا 'غازی' سرفروشی اور شہادت کی داستان بیان کرتا ہے۔

سعدیہ بشیر کی غزل کا مطلع خوب ہے۔ خالی ہاتھ، دلاسے اور کاسے

ہاتھ خالی تھے سو ہم کو کاسے ملے بعد مرنے کے کتنے دلاسے ملے

شہر گاؤں بستیوں کی رونق پیاروں سے ہوتی ہے۔ ندیم عباس اشرف کی غزل کا شعر خوب ہے

تیرے بعد آیا میں اک بار ترے گاؤں میں — راستہ اب کہ ترے گاؤں کا ویران بھی تھا

ستمبر کا شمارہ خوبصورت تحریروں سے مزین ہے۔ تمام تحریریں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں، اپنے اپنے موضوع کی مناسبت سے خوب ہیں۔

عقیل رحمانی

محترم عمران منظور صاحب!

السلام علیکم!

مزاج بخیر۔ دلی شکر گزار ہوں کہ آپ نے اگست 2021 کے شمارے میں خاکسار کی پرانی بھیجی ہوئی تخلیقات کو نمایاں جگہ دے کر عزت افزائی کی۔ اکتوبر 2021 کے لیے ایک عدد نعت اور غزل ارسال ہے۔

ستمبر 2021 کا شمارہ مکمل نہیں پڑھا۔ ''شاہ داستان'' پسندیدہ تحریر ہے۔ خالد احمد صاحب کی زندہ نعتوں پر تشبیب کا فکری اکتشافی وعددی مطالعہ انتہائی دلکش انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔ سیدہ آیت گیلانی دلی مبارکباد کی مستحق ہیں ''پہلو میں چلتی موت'' کے مصنف سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ کلیم خارجی صاحب نے ہماری عیسائی برادری کو ہندو دھرم کے مطابق شودر بنا کر پیش کیا جو مجھے قطعاً پسند نہیں آیا۔ لبنیٰ مقبول کی تحریر ''غازی'' ستمبر کی تھیم سے مطابقت رکھتی تھی اور زندہ جاوید اور معتبر تحریر تھی۔ ''عید ڈینگی'' آغا گل صاحب کی نویلی تحریر تھی۔ اشاروں کنایوں میں دورِ حاضر کے چند کرداروں کی بھرپور عکاسی تھی۔ شعری حصہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ اللہ آپ کو اور آپ کی ٹیم کو سلامت رکھے آمین۔ محمد ارشاد صاحب کا خط شمارے پر تبصرہ کم اور علمی و ادبی قابلیت کا اظہار زیادہ لگا۔ اللہ ان کے شعری ذوق اور علم عروض پر دسترس کو برقرار رکھے آمین۔

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور و اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!

یوم دفاع کی مناسبت سے سرورق دلکش تھا۔ ''عباس تابش'' کے ''بہتر نشتر'' کا شمار عہد حاضر کے ان شعرا میں ہوتا ہے، جنھیں اپنا زمانہ بچشم خود دیکھنے کا موقع میسر آیا اور خواص و عوام میں بھرپور پزیرائی نصیب ہوئی۔ ''کسی شاعر و ادیب یا کسی بھی شعبے کے شخص کا اپنی زندگی میں ہی شہرت و عزت سمیٹنا خوش قسمتی ہی کہا جاسکتا ہے۔ ورنہ ایسے شاعروں کی کمی نہیں جنھیں زمانہ آج اردو ادب کے بڑے شعرا میں شمار کرتا ہے۔ ان پر تحقیق ہورہی ہے۔ کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ خراج تحسین پیش کیا جارہا ہے مگر یہ سب کچھ انھیں زندگی میں نہ ملا۔ یہ بات ہمارے لیے دلچسپی کا باعث تھی کہ عباس تابش کی پہچان بننے والا شعر ''ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش، ''میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے'' ان کے زمانہ طالب علمی کا ہے۔ افتخار عارف کے عباس تابش کے لیے لکھے گئے الفاظ سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ''کتاب دوستی'' پر یوسف عالمگیرین کی تحریر بھی متاثر کن تھی۔ انھوں نے کتاب کی اہمیت و صورت کو اجاگر کرتے ہوئے مختلف کتابوں پر تبصرے لکھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجی کے آنے کے بعد سے ہمارا کتاب سے تعلق کمزور ہوا ہے۔ موبائل، انٹرنیٹ نے انھیں کتاب سے دور کر دیا ہے، مگر ایسا ہمارے ہاں ہی ہوا ہے۔ جہاں سے یہ ٹیکنالوجی آئی ہے۔ وہاں کے لوگ آج بھی کتاب سے جڑے ہوئے ہیں۔

خطوط کی محفل میں وردانہ نوشین خان نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ غائب و حاضر رہنے سے ادیبوں و شاعروں کو کوئی فرق نہیں پڑتا

اور ادب کا حصہ بننا محض ذات کی طمانیت ہے ہی ایسی تلخ حقیقت ہے جس کا ادراک انسان کو اکثر مواقع پر ہو جاتا ہے اور اس حقیقت کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ آپ اگر حاضر ہیں تو لوگ آپ کا ذکر کر دیں گے۔ غائب ہیں تو چند ماہ کے بعد بھول جائیں گے کہ ہمارے درمیان کون تھا، جو منظر سے اچانک غائب ہو گیا۔ ادبی طور پر ہمارے رویے کیسے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک واقعہ معلوم ہوا جو آپ سے شیئر کرنا چاہوں گا۔ میں اپنی ڈاک کا پتہ کرنے روزانہ پوسٹ آفس جاتا ہوں۔ پوسٹ آفس کا ایک ملازم زمانہ طالب علمی سے شاعری کر رہا ہے۔ چند سال پہلے اس کا تبادلہ قریبی شہر میں ہو گیا تھا۔ اب کچھ دن پہلے واپس آیا ہے تو ایک دن شعر و ادب کے حوالے سے خوب گپ شپ ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ برسوں سے شاعری کر رہے ہیں۔ مشاعروں میں کیوں نہیں جاتے تو انھوں نے بتایا کہ چند سال پہلے تک میں مشاعروں میں چلا جاتا تھا، مگر اب بالکل نہیں جا رہا دل نہیں مانتا۔ میں نے جب زیادہ کریدا تو کہنے لگے۔ چار سال پہلے ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے موٹر سائیکل پر گاؤں سے آیا تھا۔ منتظمین نے بڑے جوش و خروش سے مجھے دعوت دی اور لازمی آنے کا کہا۔ مشاعرہ شام کو تھا۔ میرا خیال تھا کہ مشاعرہ 10 بجے تک ختم ہو جائے گا تو واپس چلا جاؤں گا۔ مگر مشاعرہ رات 2 بجے ختم ہوا جونہی ختم ہوا ہال سے باہر نکل کر دیکھا تو بارش ہو رہی تھی۔ بارش رکی تو شہر میں رہنے والے شاعر چلے گئے۔ منتظمین بھی خاموشی سے اپنی گاڑی میں بیٹھے اور نکل گئے۔ میں توقع کر رہا تھا کہ رات 2 بجے کا وقت ہے، کم از کم مشاعرے میں بلانے والے دوست کہیں گے کہ رات رک جاؤ، صبح چلے جانا مگر کسی نے مروتاً کہنا بھی گوارا نہ کیا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور موٹر سائیکل اپنے گاؤں کی طرف دوڑا دی۔ رات 2 بجے جانے کی وجہ سے دل و دماغ میں انجانا خوف تھا۔ ابھی گاؤں سے کچھ فاصلے پر تھا کہ ایک جگہ خراب سڑک کی وجہ سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ خاصی چوٹیں آئیں۔ اس دن کے بعد سے میں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ سے کسی مشاعرے میں نہیں جاؤں گا۔ صرف یہ سوچ کر کہ میری زندگی کی ضرورت میرے گھر والوں کو ہے، کسی اور کو نہیں۔ بقول شاعر:

جہاں میں کون کسی کا خیال رکھتا ہے
ہر ایک شخص بس اپنا ملال رکھتا ہے

محمد ارشاد کی خورکلامیاں اور انعام الحق جاوید کے قطعات پسند آئے۔ امجد اسلام امجد کی غزل کے یہ اشعار دل کو بھائے:

آفت ہو یا مشکل کوئی، دور کہیں رک جاتا ہے
میرے گھر کے ہر راستے پر ماں کی دعا کا پہرا ہے

سب کو امجد گھیر رکھا ہے، اپنے اپنے مطلب نے
کس کی آنکھیں اندھی ہیں؟ اور کون یہاں پر بہرا ہے

مختلف غزلوں کے یہ اشعار بھی اچھے لگے:

وہ اجنبی ہے اسے پہلی بار دیکھا ہے
پکارتا ہے مگر آشنا لہجے میں

خدائی لہجہ خدا کو ہی زیب دیتا ہے
بشر ہوں میری صدا ہے دعا کے لہجے میں

باقی احمد پوری

کسی کے ہونٹوں پہ پیاس دیکھی کسی کے ہاتھوں میں جام دیکھا
بس اپنی دھرتی پہ ہم نے برسوں یہی فسردہ نظام دیکھا

یہاں امیر و وزیر دیکھے سبھی صغیر و کبیر دیکھے
انا کا جو بھی اسیر دیکھا وہ خواہشوں کا غلام دیکھا

اقبال سرد بہ

یہ حویلی کا بڑا صحن مبارک ہو تمھیں
ہم سے ناداں تو کونے سے بہل جاتے ہیں

شاعر علی شاعر

ابھی تو چند گھڑیاں ہی جدائی میں گزاری ہیں
کھلے گی خیمۂ دل کی طناب آہستہ آہستہ

فائق ترابی

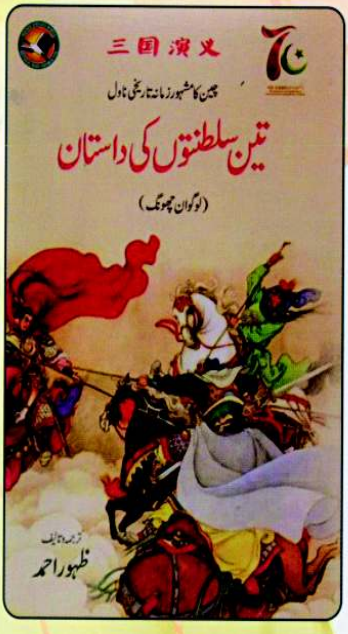

پرتو
تحقیق و تدوین
نوشین شوکت

三国演义
چین کا مشہور زمانہ تاریخی ناول
تین سلطنتوں کی داستان
(لوگوان چھونگ)
ترجمہ و تالیف
ظہور احمد

FICTION HOUSE
مغربی استعمار
اور
مولانا ظفر علی خان کی شاعری
ڈاکٹر سبحان اللہ

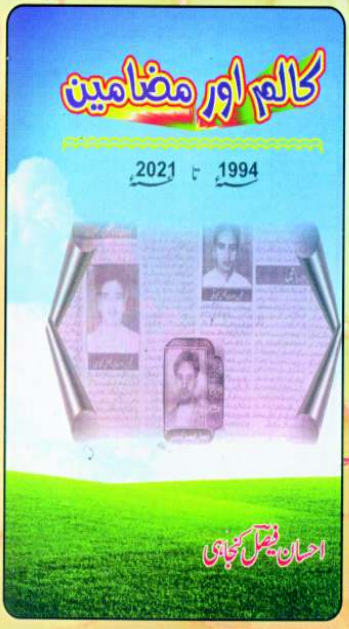

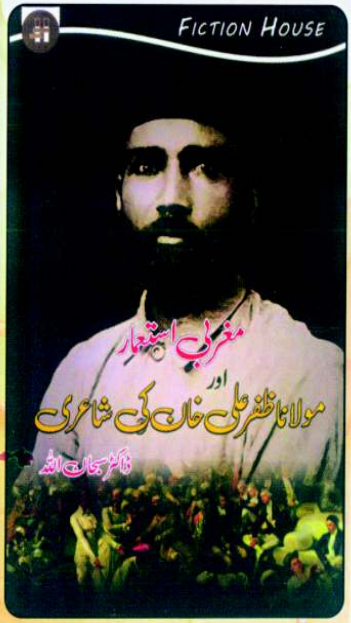

کالم اور مضامین
1994 تا 2021
احسان فیصل کنجاہی

اطلاع

تمام شعرا کرام، نثر نگار اور قلمی تعاون کرنے والے خواتین وحضرات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ

ماہنامہ بیاض، لاہور میں اب صرف ، شاعری افسانہ، طنز ومزاح، تنقید اور ادبی نوعیت کے خطوط ہی شائع کیے جائیں گے۔

ادبی رپورٹ، سفرنامہ، فلیپ، دیباچہ، یادیں، انشائیہ اور آبیتی بھیجنے والوں سے ہم پیشگی معذرت خواہ ہیں۔

(ادارہ)